سیرۃ النبی ﷺ

جلد اول

علامہ شبلی نعمانی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

ISCUS LIBRARY
18464
13420
MALEGAON

کتابِ مستطاب

سِیرۃُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ اول

از ولادت تا ختم سلسلۂ غزوات مع مقدمہ مشتمل بر نقد فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل ظہور بعثت

تالیف

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۱۷۳

کتاب : سیرۃ النبیؐ حصہ اول

مصنف : علامہ شبلی نعمانیؒ

صفحات : ۵۰۸

طبع جدید: ۲۰۱۹ء

قیمت :

مطبع : معارف پریس، اعظم گڈھ

ناشر : دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڈھ

باہتمام : ڈاکٹر فخر الاسلام

ISBN: 978-93-80104-67-6

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. BOX NO. : 19

SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)

e-mail : shibli_academy@rediffmail.com

Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

سیرۃ النبی ﷺ حصہ اول

۲ ہجری
تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات
۲۱۵ - ۲۶۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ طبع جدید

الحمدلله رب العالمین والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم

محمد الامین وعلی اله واصحابه اجمعین.

''سیرت النبیؐ'' دارالمصنفین کے سرمایۂ علم ودانش کی متاع بے بہا ہے، علامہ شبلی ومولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کی نیت کی برکت وپاکیزگی تھی کہ اس کو وہ حسن قبول عطا ہوا جو قابل رشک ہے۔

سات جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب کی متعدد طباعتوں میں خوب سے خوب تر کی خواہش وکوشش جاری وشامل رہی، لیکن کتابت کے تسامحات کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جاسکا، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے دیباچوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر طبع نو میں اضافوں اور حوالوں کی تخریج کے ساتھ تصحیح کی ضرورت پیش آتی رہی، چندسال پہلے اس کے نہایت دیدہ زیب ایڈیشن میں خاص محنت کی گئی، تاہم غلطیاں اس میں بھی رہ گئیں، اسی لیے زیر نظر طبع جدید کی اشاعت کے وقت اس کی تصحیح پر مزید توجہ کی گئی، بعض آیات واحادیثِ مبارکہ کے حوالوں اور نمبروں کو درست کیا گیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طبع جدید کو شرفِ قبولیت بخشے اور ملت وانسانیت کے لیے اس کے نفع و افادہ کو عام فرمائے۔ (آمین)

ڈائریکٹر

اشتیاق احمد ظلی

۱۸ر جنوری ۲۰۱۱ء

BCUS LIBRARY
18464
13420
MALEGAON

کتاب پھٹنے یا گم ہونے کی صورت میں کتاب کی
قیمت کی دوگنی رقم ادا کرنا پڑے گی اسلئے
کتاب لیجاتے وقت اچھی طرح جانچ کرلیں بعد
میں شکایت فضول ہوگی۔ مہر ین لکسن نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع پنجم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم
محمد الامین وعلی آلہٖ واصحابہ اجمعین۔

سیرۃ النبی دارالمصنفین ، شبلی اکیڈمی کی سب سے مقدس ومقبول کتاب ہے ، اردو تو کیا عربی میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ، اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔

تقریباً ایک صدی پہلے جب علامہ شبلیؒ نے اس مبارک کتاب کی تالیف کا آغاز کیا تھا تو ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی اور وہ اس کے صرف دو حصے ہی لکھ سکے تھے کہ پیام اجل آ گیا ، ان حصوں کی اشاعت اور علامہ شبلی کے تیار کردہ خاکے کے مطابق بقیہ حصوں کی ترتیب وتالیف کی سعادت ان کے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے حصے میں آئی رحمهما اللہ تعالیٰ ۔

اُس وقت علامہ شبلی طرح طرح کے امراض اور مختلف خانگی وقومی مسائل میں الجھے ہوئے تھے ، اس کے علاوہ اس زمانے میں حوالے کی کتابیں بھی آج کل کی طرح مطبوع اور دستیاب نہیں تھیں ، اسی لئے مولانا سید سلیمان ندوی کو اس میں کہیں کہیں اضافے کی ضرورت پیش آئی اور وقتاً فوقتاً حوالوں کی تخریج کرنی پڑی ۔ آخری مرتبہ انہوں نے ۱۳۶۴ھ/ہجری میں اس جلد کی تصحیح اور حوالوں کی تخریج کرائی تھی ۔ مگر اس کے بعد بھی متعدد حوالوں کا اندراج رہ گیا تھا اور بار بار چھپنے اور بعض دوسری وجہوں سے متعدد غلطیاں راہ پا گئی تھیں ۔ اس لئے قدردانوں کی طرف سے سیرۃ النبیؐ کی جلدوں کے ایسے صحیح ومحقق اڈیشن کا تقاضا برابر ہو رہا تھا جس کی طباعت اچھی ہو ۔

یہ بہت دقت طلب مگر ضروری کام تھا ، اس لئے ہمارے بعض رفقاء سیرۃ النبیؐ کی تمام جلدوں کی تصحیح ومراجعت کے کام میں مشغول ہو گئے اور چند برسوں میں ان کی محنت اور کوشش سے

اس کے شروع کی چار جلدیں شائع ہوگئیں۔

دارالمصنفین کے خاص کرم فرما مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری صاحب عرصے سے عرب ملکوں میں قیام پذیر ہیں اور وہاں سے چھپنے والی دیدہ زیب اور خوبصورت کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کے عادی ہیں، اس لئے جب ان کی نظر سے سیرۃ النبی کی یہ چاروں مطبوعہ جلدیں گذریں تو انہیں خیال ہوا کہ اس بلند اور مہتم بالشان تصنیف کو اور زیادہ بہتر اور عمدہ چھپنا چاہئے، انہوں نے فرمایا کہ مصارف کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ اس کا انتظام ہو جائے گا، اس سے ہمارا حوصلہ بلند ہوا اور تمام جلدوں کی طباعت کا ازسرنو منصوبہ بنایا گیا اور اب یہ جلدیں مولانا کی تحریک وتعاون سے شائع کی جارہی ہیں جس کے لئے کارکنانِ دارالمصنفین ان کے ممنون ہیں۔

اس سے پیشتر کمپیوٹر کمپوزنگ سے جو چار جلدیں شائع ہوئی تھیں ان میں حصہ اول کی طباعت ڈاکٹر نسیم جہاں اور حصہ دوم کی مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی کے عطیے سے ہوئی تھی۔ اول الذکر علامہ شبلی کی حقیقی پوتی اور موخرالذکر ان کے خاص قدرداں اور بڑے شیدائی ہیں، ان دونوں حصوں کی تصحیح ومراجعت کا کام راقم نے اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری کی مدد سے انجام دیا تھا، ان ہی کی محنت سے ان کی ببلیوگرافی اور اشاریے بھی تیار ہوئے تھے۔

اب نئے منصوبے کے تحت اس حصہ کو کمپوزنگ کے لئے دینے سے پہلے پھر تصحیح ومراجعت کی گئی ہے، جس میں راقم اور مولوی محمد عارف عمری کے علاوہ مولوی کلیم صفات اصلاحی نے پوری مدد کی ہے، مولوی ضیاء الرحمٰن اعظمی نے مولوی سلیم جاوید سے مل کر کاپیاں اور پروف پڑھے، کمپوزنگ حافظ عبدالرحمٰن عباسی قمر (ایم، اے) نے کی ہے اور ماسٹر عبدالمنان ہلالی کی دلچسپی سے اس کی اشاعت ہورہی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

اس اشاعت میں مطبع کے اغلاط اور دوسری فروگذاشتوں کی تصحیح میں امکان بھر پوری کوشش کی گئی ہے مگر انسان کا کوئی کام نقص وعیب سے خالی نہیں ہوتا اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اغلاط کی نشاندہی ضرور کردیں تاکہ آئندہ ان کی تصحیح ہوجائے۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم سیرۃ النبی ﷺ جلد اول

سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لئے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچ مداں کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہئے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا، مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لئے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بہ جز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی اور مقابلہ اور تصحیحِ ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسیوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سرِ نو مراجعت میں ان سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچ مداں جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ

وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفعِ شبہہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوئی اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوۂ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایات میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں ۱۰ ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ دقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی، مگر ان کو مل نہ سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آ جانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح و اضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو از سرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیحِ بیان، دفعِ شبہہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دے دیئے گئے، تا کہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

۶۔ طبع اول کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں، ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا اور بعد کو اس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو اس کو بڑھایا گیا۔

۸۔ حضور انور ﷺ کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا ﷺ لکھنے کا اہتمام کیا گیا تا کہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچ مداں کے خطا کار قلم سے حضرت کعبؓ بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابی رسول اللہ ﷺ کی برأت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش　　　عذر بہ درگاہ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ سے (۱) ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو، اب یہ موجودہ نسخہ طبع اول سے بہت سی باتوں میں بہتر ہو گیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگذر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرما کر اس گنہ گار کے لئے بخشائش کا ذریعہ بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچ مداں

سید سلیمان ندوی

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

---

(۱) یہ عبارت سیرۃ النبی جلد اول طبع اول کے صفحہ ۲۵۵ کی سطر ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷ میں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ نبویؐ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثناء میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ خاکسارانِ دارالمصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا اور امراء اور والیانِ ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے فن کی میزانِ نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زایچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انہوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا کہ اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں، ان کو یہی نسخہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تا کہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے، انشاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی

۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ/ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع اول

سیرۃ نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج ۷ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استادِ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمد للہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبک دوش ہوتا ہوں، ع

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنفؒ اپنی چار سال کی جاں کاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسنِ عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانہ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرۃ نبویؐ کے لکھنے کا خیال **الفاروق** کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ احد تک وہ لکھ بھی چکے تھے (۱) کہ بعض مشکلات کی بنا پر رک گئے، لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انہوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا، چنانچہ پچاس ہزار روپئے کے سرمایہ کے لئے انہوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا، سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقرائے امت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اخروی ازل ہی سے **خادمة الملة النبوية مخدومة الامة المحمدية** نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرماں روائے بھوپال **متع اللہ المسلمین بطول بقائها و دوام ملکها** کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب کے آگے بڑھیں اور سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا، فرماں روا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں، آیندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس ﷺ سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

---

(۱) یہ مسودہ اب تک موجود ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گذاری کے لئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی لیکن فرماں روائے بھوپال نے مصنف ؒ کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلۂ فیض کو برابر جاری رکھا، مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق (۱) اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے، جن کی مروحہ جنبانی سے نسیمِ سعادت کے جھونکے اس باغ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات ''واقعات متفرقہ'' کے عنوان سے لکھ دیئے جائیں، چنانچہ مبیضہ پر سنہ ۴ ؍ہجری تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیاتِ متفرقہ کا اضافہ کر دیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈھ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف ؒ کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ صلعم یا جملہ ہائے معترضہ کے سوا جو چند فقرے اور عبارتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے، لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحے تک پہنچ جائے گی اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کر دی گئی اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعتِ اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ حسبی اللہ و نعم الوکیل۔

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، ان کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلم زدہ مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظم گڈھ ۲۰ ؍ربیع الثانی ۱۳۳۹ ؍ہجری

---

(۱) مکاتیب جلد اول صفحہ ۲۶۱۔

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونین کے دربار میں
اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"

شوال ۱۳۳۰ھ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

(فنِ روایت)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

سیرت نبویؐ کی تالیف کی ضرورت: عالمِ کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق وتربیت کی اصلاح وتکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد وتقویٰ، عصمت وعفاف، احسان وکرم، حلم وعفو، عزم وثبات، ایثار ولطف، غیرت واستغنا کے اصول وفروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ وپند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جا کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر وزور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے، جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے، دنیا

میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب ان ہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

پیغمبروں پر آنحضرت ﷺ کی تاریخی فضیلت: لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے اس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتبِ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرماں روائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامعِ کامل (۱) کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگین بھی ہو اور

(۱) یہاں پر کتاب کی اس عبارتِ بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک با کمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ۔۲:۲۸۵) — ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَّاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ۔۲:۲۵۳)

یہ حضراتِ مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس یعنی جبریل سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتبِ کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے، ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام تمام کمالاتِ نبوت و فضائلِ اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کی ضروریات اور مصالحِ الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیاءؑ میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور (بقیہ حاشیہ ص ۳ پر)

گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرماں روائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریادل بھی، یہ برزخِ کامل، یہ ہستیِ جامع، یہ صحیفۂ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ۔۵:۳) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور ہے کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے، رہنمائی کے کام آئے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیانِ مذہب جامعیتِ کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیحؑ کی

(بقیہ حاشیہ ص ۲) دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع ومحل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کے وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفسِ کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیائے کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات وفضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیمؑ وعیسیٰؑ کی اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے، یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا، (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر، ج ۳ ص ۲۱)

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوالِ مبارکہ میں رونما رہا ہے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لئے بہ ضرورتِ احوال آپ ﷺ کے تمام کمالات آپ ﷺ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے اور آپ ﷺ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت بنی اور ظلمت کدۂ عالم کا ہر گوشہ آپ ﷺ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پرنور ہوا ﷺ، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے، جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسرِ شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (معارف محرم وصفر ۱۳۵۶ھ مطابق مارچ واپریل ۱۹۳۷ء میں مضمون "خلیل کی بشریت") ''س''

۳۳ سالہ زندگی میں صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحانِ دین صرف شاہ نامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے جو حضرت موسیٰ کے ۳۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے، جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گذرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلم بند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے: یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے کیوں کر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، ستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے غرض سعی و عمل جد و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو ''شخص'' کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں وہ کس وسعت اور استقصا و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں تا کہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فردِ کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورہ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک ''محمد'' ﷺ (رسول اللہ) ہے، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَسَلِّمْ صَلٰوۃً کَثِیْراً کَثِیْراً، یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریاتِ دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

علمِ کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت: اگلے زمانہ میں سیرۃ کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علمِ کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزءِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟۔

یورپ کے مورخین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلامؐ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو ان ہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ

آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو پیغمبر ﷺ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمعِ انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کر دیا اور میں نے سیرۃ نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بہ ظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامعِ مشکلات نہیں ہو سکتی۔

سیرت اور حدیث کا فرق: آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت (۱)

---

(۱) اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے جو آج کل کی قلتِ علم اور ناآشنائیِ فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فنِ حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے، جو آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں مثلاً صحیح بخاری، مسلم، تو یہ کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ "سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں:

۱۔ پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور اربابِ رجال کی اصطلاحِ قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے ہیں، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجهاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا، چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اربابِ سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام اربابِ سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلمؒ ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاریؒ کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے، کہ تمام اربابِ سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیثِ صحیح تمام اربابِ سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ ص ۷ پر)

پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرۃ نبویؐ میں لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ ص ۶) ا۔ غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

لا یختلف اهل السیر ان غزوة ذی قرد کانت قبل الحدیبیة فیکون ما وقع فی حدیث سلمة من وهم بعض الرواة

اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوۂ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد ج ۷ ص ۳۵۳) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں:

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد اصح مما ذکره اهل السیر

تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفینِ سیرت نے بیان کی ہے۔

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں، انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے، اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی۔ لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیثِ صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی، لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

ودل هذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیه اهل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وان ذلک کان به قبل تضلعه منها ولخروج نسخ کتابه و انتشاره لم یتمکن من تغییره۔

(زرقانی بر مواهب جلد ۳ ص ۱۱)

اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیرت سے اتفاق کر کے احادیثِ صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارتِ فن کے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

۲۔ ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

واما شیخه الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح وان جمیع اهل السیر علی خلافه

(فتح الباری جزء ہفتم ص ۳۲۲)

باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث کی نسبت غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۸ پر)

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح وما قد انکرا

یعنی طالبِ فن کو جاننا چاہئے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں، صحیح بھی اور قابلِ انکار بھی۔

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث ورجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور ان سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی، جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ ﷺ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلم بند کئے گئے

(بقیہ حاشیہ ص ۷) اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدتِ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فنِ صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

۳۔ مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فنِ حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فنِ حدیث سے کم رہا۔

۴۔ جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرۃ کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیلِ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ "سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، طبقات ابن سعد، کتاب الحروف فی الصحابۃ لابن السکن، کتاب الاحاد لعبداللہ بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی (۱) طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابۃ صرف انہیں بزرگوں کے حالات میں ہیں، کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درجِ تحریر ہو سکے ہیں۔

سیرۃ نبویؐ کے متعلق قدمانے جو ذخیرہ (۲) مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیوں کر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ: عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفۂ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نابتی خط تھا، جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے یہ نام تھے، ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے

(۱) ان کتابوں کا ذکر، استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔ (۲) یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں، جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے۔ یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمر بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا، جو بنو مخلد بن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے، ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم (آنحضرت ﷺ کے جدامجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے۔

حق عبدالمطلب بن هاشم من اهل مكة على	یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص
فلان بن فلان الحميرى من اهل وزل صنعا عليه	پر ہے، جو صنعا کا رہنے والا ہے، یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں،
الف درهم فضة كيلا بالحديدة ومتى دعاه بها	جب طلب کیا جائے گا، وہ ادا کرے گا خدا اور دو فرشتے اس
اجابه شهد الله والملكان (۱)	کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کرام کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، طلحہؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، ابوحذیفہؓ بن عتبہ، ابوسفیانؓ، شفاؓ بنت عبداللہ (۲) وغیرہ۔

بدر کی لڑائی جو ۲ ہجری میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ

---

(۱) الفہرست ابن ندیم ص ۷ و ۸ مطبع رحمانیہ مصر س'' (۲) فتوح البلدان ذکر خط ص ۴۷۱ و ۴۷۲ مطبعہ بریل لیڈن یورپ، ۱۸۶۶ء۔

لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔(۱)

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلم بند ہوئی تھیں یا نہیں اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا، یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیثوں کے قلم بند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

لا تکتبوا عنّی ومَن کتب عنی غَیر القرآن فلیمحه (۲) — مجھ سے جو سنو اس کو قلم بند نہ کرو (بہ جز قرآن کے) اور کسی نے قلم بند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ کی تحریریں: لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیوں کہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آنحضرت ﷺ کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلم بند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری (کتاب العلم باب کتابة العلم ج۱ ص۲۲) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ "صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ وہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "تم لکھ لیا کرو اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے" (۳)۔

---

(۱) طبقات ابن سعد غزوہ بدر جزء۲ ق اول ص ۱۴۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الزہد باب التثبت فی الحدیث ج۲ ص ۵۳۸۔

(۳) ابوداؤد کتاب العلم باب فی کتاب العلم جلد۲ ص ۷۷، اصح المطابع لکھنؤ۔

خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہؓ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں قلم بند کرلیا کرتے تھے، صادقة تھا(۱)۔

ایک دفعہ آپؐ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلم بند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام دفتر میں درج کئے گئے۔(۲)

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ ''جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے، تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے کہ ''یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر لکھ لی تھیں''۔

متعدد قبائل کو آپ ﷺ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتب احادیث میں بعینہا منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلم بند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

۱۔ جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاصؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ وغیرہ نے قلم بند کیں (۳)۔

۲۔ تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت ﷺ نے قبائل کے نام بھیجے (۴)

۳۔ خطوط جو آنحضرت ﷺ نے سلاطین (۵) اور امراء (۶) کے نام ارسال فرمائے۔

---

(۱) جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر مطبوعہ مصر ص ۷۷ میں صادقہ کا ذکر ہے۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب کتابة الامام الناس ج ا ص ۴۳۰۔ (۳) بخاری جلد ا ص ۲۱ و ۲۲ صحیفة علیؓ و کتابته لرجل من الیمن۔ (۴) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰ باب صدقة الابل وابوداؤد جلد ا ص ۱۵۵۔۱۵۶، کتاب الزکوٰۃ باب زکوٰة السائمة۔ (۵) بخاری جلد ا ص ۵ باب کیف کان بدء الوحی و ایضاً ص ۱۵ باب ما یذکر فی المناولة۔ (۶) بخاری جلد ا ص ۱۵ حوالہ مذکور۔

۴۔ پندرہ سو (۱۵۰۰) صحابہؓ کے نام۔

آنحضرت ﷺ کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانے سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں (۱)۔

مغازی: عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ احد کے ذکر میں سائب بن یزیدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

صحبت عبدالرحمن بن عوف و طلحۃ بن عبداللہ والمقداد و سعداً فما سمعت احداً منهم یحدث عن النبی ﷺ الا انی سمعت طلحۃ یحدث عن یوم احد (۲)

میں عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ اور طلحہؓ بن عبیداللہ اور مقدادؓ اور سعدؓ کی صحبت میں رہا لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت ﷺ کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا، بہ جز اس کے کہ طلحہؓ غزوۂ احد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ وقاصؓ، اکابر صحابہؓ میں ہیں، ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بہ جز اس کے کہ طلحہؓ جنگ احد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے، خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی ج۱، تذکرہ امام زہری ص۱۰۰ (۲) بخاری جلد۲ ص۵۸۱۔

ثلاثۃ کتبٍ لیس لھا اصول المغازیُ والملاحمُ والتفسیرُ (۱)

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد ان خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے:

اما کتب التفسیر فمن اشھر ھا کتابا الکلبی و مقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اولہ الی آخرہ کذب

باقی تفسیر کی کتابیں تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

واما المغازی فمن اشھرھا کتاب محمد بن اسحاق وکان یاخذ من اھل الکتاب وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب

باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتداء سلطنت کی وجہ سے ہوئی: صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنوامیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے:

کنّا نکرہ کتابَ العلم حتی اکرھَنا علیہ ھٰؤلاء الامراءُ (۲)

ہم لوگ علم کا قلم بند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدماء کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین ہے (۳)۔

امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو ۶۵ ہجری میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطا بن دینار کے نام سے جو

(۱) موضوعات ملا علی قاری مطبع مجتبائی ص ۸۵۔ (۲) مطبوعہ مصر ص ۱۳۶۔ (۳) فہرست ابن الندیم ص ۲۴۴۔

تفسیر مشہور ہے ان ہی کی تفسیر ہے، عطا کو خزانۂ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا (۱)

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبویؐ مدون اور قلم بند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے اور تمام ممالکِ مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترا (۲)	سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمرؓ نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ (۳)

حضرت عائشہؓ کی روایتیں: حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے مہماتِ مسائل ہیں۔ اس لئے عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، عمرۃ بنت عبدالرحمٰنؒ ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوشِ تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمرؓ بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلم بند کر کے بھیج دیں۔ (۴)

مغازی پر خاص توجہ: اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبویؐ کا خاص حلقۂ درس قائم کیا جائے، عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔ (۵)

---

(۱) میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دینار ج ۲ ص ۱۹۷ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۵ھ ہجری (۲) مطبوعہ مصر ص ۳۶۔ (۳) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی ص ۱۳۴۔ (۴) تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن محمد (ج ۱۲ ص ۴۳۹) و عمرۃ بنت عبدالرحمٰن (ج ۱۲ ص ۴۳۹) و طبقات ابن سعد جزء دوم حصہ دوم ص ۱۳۴۔ (۵) تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ ج ۵ ص ۵۴۔

امام زہری اور فن سیرت: اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہم سر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انہوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے، جوان، بڈھے، عورت، مرد جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین (۱) عورتوں سے جا کر آنحضرت ﷺ کے اقوال و حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، ۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، ۸۰ ہجری میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربینِ خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی، ۱۲۴ ہجری میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ: امام زہری کے وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، ان میں سے یعقوب ابن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز، فنِ مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف صاحبِ مغازی لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور سیرت: زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ ابن عقبہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے، عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں، امام مالک ان کے نہایت مداح تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں:

۱۔ مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم ج ۹ ص ۴۴۹)

اس کا التزام کیا۔

۲۔ عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کیے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آ جاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں، جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔

۳۔ چونکہ روایتِ حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے تھے اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا (۱) ۱۴۱ ہجری میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق اور سیرت: محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی ان سے کم نہیں لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام ہے اور اس لئے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں، لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی روایت نہیں لی، لیکن جزء القراۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات ان ہی سے لیتے ہیں۔

فن مغازی کو انہوں نے اس قدر ترقی دی اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ موسیٰ بن عقبہ ج ۱۰ ص ۳۶۱۔

زیادہ تر اور قسم کی تصنیفات کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی (۱)۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انہوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے، اسلئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ رہجری میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الہ آباد میں ہماری نظر سے گذرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے، چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے اس لئے آج اس کی جو یادگار موجود ہے، وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام اور سیرت: ابن ہشام کا نام عبدالملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مورخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کی تفسیر بھی لکھی، ۲۱۳ رہجری یا ۲۱۸ رہجری میں وفات پائی۔

سیرت ابن ہشام کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ رہجری و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعدویری المتوفی فی حدود ۶۰۷ رہجری و ابو اسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام **فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب** ہے۔

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۹ تا ۴۶۔

ابن سعد اور سیرت: واقدی خود تو قابل ذکر نہیں لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابلِ اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:

كان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنّف كتاباً كبيراً في طبقات الصحابة والتابعين الى وقته فاجاد فيه واحسن (۱)

یہ موالیٔ بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مورخ ہیں، ان ہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ ہجری میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت ﷺ کے حالات میں ہیں اور یہ حصہ دراصل سیرۃ نبویؐ ہے، باقی جلدیں صحابہؓ (وتابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیبِ خاص سے دیئے اور پروفیسر سخاؤ کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزاء فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں

(۱) تہذیب التہذیب، ترجمہ محمد بن سعد ج ۹ ص ۱۸۲۔

ان کے نام مذکور ہیں، لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

امام بخاری اور سیرت: سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں، ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں، یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں ان میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے، وہ بھی دراصل سیرت نبویؐ ہے، ان میں سب سے مقدم اور قابلِ استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں، لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبویؐ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اس کا نسخہ جامع ایاصوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانحِ نبوی اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلاترتیب مذکور ہیں ۔

امام طبری اور سیرت: تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال، وثوق اور وسعتِ علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین (۱)	یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ ”ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں“ تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

فہرست متقدمین علمائے سیرت: جو لوگ خاص فنِ سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

(۱) جلد ۳ ص ۳۵۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر (۱)	۹۴ھ	حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، حضرت عائشہؓ کے آغوشِ تربیت میں پلے تھے، سیرت ومغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالما بالسیرۃ صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔
شعبی	۱۰۹ھ	مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی وسیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ "گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔"
وہب بن منبہ	۱۱۴ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے ان ہی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	۱۲۴ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی	۱۲۸ھ	نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظامِ ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبۃ الاسدی	۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ۔
ہشام بن عروہ بن زبیر	۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انہوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، جن کو وہ اپنے باپ کے

(۱) ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں اس لئے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت وعدم صحت یا قوت وضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

		واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، فنِ سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
عمر بن راشد الازدی	۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے، اساطین علم حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الاوسی	۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالماً بالسیرۃ وغیرھا۔
محمد بن صالح بن دینار التمار	۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابوالزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابومعشر نجیح المدنی	۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایتِ حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے، لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہے، امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحبِ نظر ہیں، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمٰن المخزومی	۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہؓ کے پڑپوتے تھے، فنِ حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے، سیرت نبویؐ کے اکابر علماء میں تھے، ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "من رجال اھل المدینۃ عالماً بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد ابی بکر بن عمر بن حزم الانصاری	۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے فنِ حدیث کی تدوین کی، ان کے رشتہ کی دادی عمرۃؒ، حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے۔ اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد ۱۸۰ھ	ابومعشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن اربابِ نقد کے نزدیک ان

		کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے، محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں، رے کے قاضی تھے، اہلِ نقد کے نزدیک قابلِ احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت ہائے نبویؐ کہتے ہیں، طبری میں ان کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔
ابو محمد یحیٰی بن سعید بن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں، لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفینِ مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ۷۰ ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فنِ روایت و حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے۔ انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے۔ (زرقانی مواہب جلد ۳ ص ۱۰)
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبویؐ کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ ’’اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں‘‘۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔

عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں، تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے، آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابلِ سند ہیں، فنِ مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	۲۱۳ یا ۲۱۸	ان کا ذکر گذر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمۃ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے، تاریخ وانساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں، اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کیے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علمِ سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابونعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبویؐ میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی حالات وعادات واخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح وحواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہؓ ان کی تالیف ہے، جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے، جس میں سیرت نبویؐ کا حصہ بھی شامل ہے۔
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

فہرست متاخرین علمائے سیرت: یہ قدماء کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ

میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہٖ مستقل تصنیفات ہیں اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے، خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف: سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے، جنہوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفینِ مابعد سیرتِ نبویؐ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق ان کے خوشہ چیں ہیں۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی: حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرة سید البشر ہے۔ قریباً سو ۱۰۰ صفحوں میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرت خلاطی: علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت گازرونی: شیخ ظہیرالدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے(۱)۔

سیرت ابن ابی طے: مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی (۲): مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے، علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ: حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب ویابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ: للحافظ ابن الجوزی۔

(۱) بمبئی کے کتب خانۂ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (۲) ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان میں ہے۔

اکتفاء فی مغازی المصطفی والخلفاء الثلاثہ : حافظ ابوالربیع سلیمان بن موسی الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدالبر: ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر : ابن سیدالناس کی تصنیف ہے، ابن سیدالناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نورالنبراس فی سیرۃ ابن سیدالناس : عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دوضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم : حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ: مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں، جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم رتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب : یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی: مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ: سیرت نبویؐ کے واقعات جو قلم بند کئے گئے، وہ تقریباً نبوت کے ۱۰۰ برس کے بعد قلم بند ہوئے، اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلم بند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات قلم بند کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فنِ تاریخ کا پہلا اصول فنِ روایت: لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریکِ واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

اسماء الرجال کی تدوین: ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر (۱) کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

---

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی داں فاضل ہیں، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ ”نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے“۔

اس سلسلہ میں سیکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح وتعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ ''میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا''۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں:

نام کتاب	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایۃ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبدالعجلی التوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبدالرحمٰن بن حاتم الرازی التوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دار قطنی	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو ان ہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے، جو علامہ مزّی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے، جنہوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی التوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی التوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب تہذیب التہذیب لکھی، جو بارہ جلدوں میں ہے اور آج کل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب میزان الاعتدال ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا، جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں: اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

تحقیقِ روایت کا اصول، قرآن وحدیث میں: اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کردی تھی۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ ۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْآ (حجرات۔ ۴۹:۶)	مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے، تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو۔

حدیث ذیل بھی اسی کی موید ہے۔

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع.	آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ جو کچھ سنے روایت کردے۔

دوسرا اصول، درایت: تحقیقِ واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء: یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کردیا تھا، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آگئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے اور اسی بنا پر حدِ قذف جاری کی گئی، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (نور ۲۴: ۱۱)	جن لوگوں نے تہمت لگائی، وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں مِنْكُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے:

جماعة من المومنين	یعنی یہ تہمت لگانے والے، مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ	اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا

بِهٰذَا سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (نور-۲۴: ۱۶) مناسب نہیں۔ سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایۃ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلافِ قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہئے کہ غلط ہے۔

اس طرزِ تحقیق یعنی درایت کی ابتداء خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انہوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہوگی۔

محدثین کے اصولِ درایت: جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

قال (۲) ابن الجوزی و کل حدیث رأیته یخالف العقول اویناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لا تعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم او یکون مما یدفعه الحس والمشاهدة اومباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذلک التاویل او یتضمن الافراط

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ یا کتاب وسنتِ متواترہ یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو،

(۱) صحیح ترمذی ابواب الطہارۃ باب الوضوء مما غیرت النار ج ا ص ۲۴۔ (۲) فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے، اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔ ۱۲

بالوعيد الشديد على الامر اليسير او بالوعد العظيم على الفعل اليسير وهذا الا خير كثير موجود فى حديث القصاص والطرقية ومن ركة المعنى لا تا كلوا القرعة حتى تذبحوها ولذ اجعل بعضهم ذلك دليلا على كذب راويه وكل هذا من القرائن فى المروى وقد تكون فى الراوى كقصة غياث مع المهدى .... او انفراده عمن لم يدرك بما لم يوجد عند غيرهما أو انفراده بشىء مع كونه فيما يلزم المكلفين علمه وقطع العذرفيه كما قرره الخطيب فى اول الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعى على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت .

(اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے، مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے، یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ.......... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے، اس سے ملا تک نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے، کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

روایت کے اصول: اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۲۔ جو روایت اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۴۔ قرآن مجید یا حدیثِ متواتر یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو باایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابلِ اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول: ملا علی قاری نے موضوعات (۱) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ "جو شخص لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے، خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے، جس کے ستر ۷۰ زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں الخ"۔

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بیگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے"۔

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ وہ حدیث جو واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ "دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے"۔

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آبِ رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"۔

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا"۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے" یا یہ کہ "مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے"۔

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہیں، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

---

(۱) نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۹۲ تا خاتمہ کتاب۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیوں کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتادے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

۱۲۔ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں ۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کردیں، مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کردیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی'، ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی گواہی بیان کی جاتی ہے، حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پاچکے تھے۔

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے، حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ ''یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی'' حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

۶۔ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیوں کر معاف ہوسکتے تھے۔

۷۔ اگر جزیہ ان کو معاف کردیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایت ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کردیئے گئے۔

تبصرہ

(فن سیرت پر)

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

امہاتِ کتبِ سیرت: ا۔ سیرت پر اگرچہ آج بھی سیکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین، چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر ان ہی کتابوں سے لئے گئے ہیں، (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے، اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہئے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کردینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلم بند نہیں کرسکتا۔

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین، اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم ان کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ

''جزء القراۃ'' میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریکِ واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابنِ اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگر چہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلا معیار سے فروتر ہیں، ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ ''وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا'' ابوحاتم کہتے ہیں ''وہ استناد کے قابل نہیں'' نسائی کہتے ہیں، ''وہ ضعیف ہے''۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی روات میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخِ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتب حدیث و سیرت میں فرقِ مراتب: سیرت کی کتابوں کی کم پایگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی، یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وما قد انکرا	طالب کو جاننا چاہئے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

فنِ سیرت میں محدثین کی مسامحت: یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائلِ اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہو گئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا

درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل میں لکھتے ہیں (۱)۔

قد رواه من صنف فی عمل یوم ولیلة کابن السنی وابی نعیم وفی مثل هذه الکتب احادیث کثیرة موضوعة لا یجوز الاعتماد علیها فی الشریعة باتفاق العلماء

اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں، مثلاً ابن السنی اور ابو نعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا ''اے خدا میں تجھ کو محمد ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کردے'' خدا نے کہا ''تم نے محمد کو کیوں کر جانا'' حضرت آدمؑ نے کہا ''میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے، وہ ضرور تجھ کو محبوب ترینِ خلق ہوگا'' خدا نے کہا ''آدمؑ! تم نے سچ کہا اور محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا'' حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

واما تصحیح الحاکم لمثل هذا الحدیث وامثاله فهذا مما انکره علیه ائمة العلم بالحدیث وقالوا ان الحاکم یصحح احادیث وهی موضوعة مکذوبة عند اهل المعرفة بالحدیث .... وکذالک احادیث کثیرة فی مستدرکه یصححها وهی عند ائمة اهل العلم بالحدیث موضوعة (۲)

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں، جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابو الشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں: (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

وفیها احادیث کثیرة قویة صحیحة وحسنة واحادیث کثیرة ضعیفة موضوعة واهیة وکذالک ما یرویه خیثمة بن سلیمان فی

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں، صحیح ہیں اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے

(۱) مطبوعہ مطبع المنار ص ۹۹۔ (۲) کتاب التوسل مطبوعہ المنار ص ۱۰۱ (نیز تذکرۃ الحفاظ ذہبی ترجمہ حاکم)

فضائل الصحابة وما يرويه ابو نعيم الاصبهاني في فضائل الخلفاء في كتاب مفرد وفي اول حلية الاوليا .... وما يرويه ابوبكر الخطيب و ابو الفضل بن ناصر و ابوموسى المديني و ابو القاسم بن عساكر والحافظ عبدالغني وامثالهم ممن له معرفة بالحديث .

ہیں اور وہ حدیثیں جو ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب اور حلیۃ الاولیا کے شروع میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔

غور کرو، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال وحرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعاتِ ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ ''قیامت میں خدا آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا'' امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ دیا کہ ''خدا کا کوئی ہم نشیں نہیں''۔ اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں (۱)۔

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور امام مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کاملِ فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل ومناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق وتنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت ﷺ عالمِ وجود میں

(۱) موضوعات ملا علی قاری ص ۱۳ مطبوعہ دہلی۔

آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتشِ فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہوگیا، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہوگئیں، اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیئے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کردیئے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت ﷺ کے حالاتِ ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہؓ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت ﷺ سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دوراز کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ "جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت ﷺ کو اٹھالے گیا اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں" (۱)۔

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں۔

تصانیفِ سیرت میں کتبِ احادیث کی طرف سے بے اعتنائی: ۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا، اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

(۱) مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے، اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں، میں نے معمولی ٹکڑا نقل کردیا ہے۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں، جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث میں موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن ابی کو یہ خط لکھا کہ "تم نے محمد ﷺ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا استیصال کر دیں گے" (۱)، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفینِ سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودلّ ھذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر ممّا وافق فیه اھل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وانّ ذالک کان منه قبل تضلّعه منها ولخروج نسخ کتابه وانتشاره لم یتمکن من تغییره (۲)	یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔

مصنّفین سیرت کی تدلیس: ۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، ان ہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد

(۱) غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔ (۲) زرقانی جلد ۳ ص ۱۱

کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصولِ روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا: ۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے، صحابہ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصولِ روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرقِ مراتب جس طرح فطرتاً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا، اسی بنا پر کیں۔

رواۃ میں اختلافِ مراتب: اختلافِ مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔

تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث: لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرحِ صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (ص ۱۰ و ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه ﷺ يوما ما اوزاره لماما او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لا زموه و عزروه ونصروه واتبعوا النور الذى انزل معه اولئك هم المفلحون.

یہ مقولہ کہ صحابہ عادل ہیں، ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت ﷺ کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت ﷺ سے کسی غرض کے لئے ملا اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ التزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربینِ صحابہؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بے جا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا: ۵۔ اربابِ سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمحِ نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بہ خلاف اس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا: ۶۔ یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آسکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے، جو غیر معمولی ہے، تجربۂ عام کے خلاف ہے، گردو پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاجِ ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجۂ وثوق کافی نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ داں ہونا چاہئے۔

کم سن راویوں کی روایت: مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کرسکتا ہے، یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کی روایت کی، تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن الربیعؓ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے، آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اظہارِ محبت کے طور پر ان کے منھ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہوکر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہوسکتی ہے (۱)۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کم سن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے۔

ولکن قد منع قوم القبول هنا ای فی مسئلة الصبی خاصة فلم یقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبی مظنة عدم الضبط وهو وجه للشافعیة .... وکذا کان ابن المبارک یتوقف فی تحدیث الصبی (۲)	(لیکن ایک جماعت یہاں قبولِ روایت سے منع کرتی ہے، خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی، شوافع کی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ بن مبارک بھی بچہ کی روایتِ حدیث کرنے میں توقف کرتے ہیں)

لیکن اثبات ونفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان

(۱) یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۶۶ تا صفحہ ۱۶۸ میں ہے۔ (۲) ص ۱۶۴۔

کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گود یوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟۔

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے۔

قبول اخبار الصبی الممیز فی ما طریقه المشاهدة بخلاف ما طریقه النقل کالافتاء وروایة الاخبار و نحوه (نسخہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۲۲)

باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں، مثلاً فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے۔

ثم الضبط نوعان ظاهر و باطن فالظاهر ضبط معناه من حیث اللغة والباطن ضبط معناه من حیث تعلق الحکم الشرعی به وهو الفقه ومطلق الضبط الذی هو شرط فی الراوی هو الضبط ظاهر اعند الاکثر لانه یجوز نقل الخبر بالمعنی فیلحقه تهمة تبدیل المعنی بروایته قبل الحفظ او قبل العلم حین سمع ولهذا المعنی قلت الروایة عن اکثر الصحابة لتعذر هذا المعنی قال وهذا الشرط وان کان علی ما بیّنا فان اصحاب الحدیث قل ما یعتبرونه فی حق الطفل دون المغفل فانه متی صح عندهم سماع الطفل او حضوره اجازوا روایته. (ص ۱۲۱)

پھر ضبط (۱) کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے، اکثروں کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے کیوں کہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بنا پر سنتے وقت قلت حفظ، یا قلت علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہو سکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں، کیوں کہ مفہوم کا بعینہ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے، لیکن محدثین بچہ کے حق میں (بے عقل کے حق میں نہیں) اس کا اعتبار نہیں کرتے، بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

راویوں میں فقاہت کی شرط: ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، ان کی روایت اگر قیاسِ شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:

---

(۱) ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

ووجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع و قلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلك العبارات ليست مترادفة بل قدروى ذلك المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوى غير فقيه احتمل الخطاء فى فهم المعنى المرادى الشرعى .... ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدا الى الصحابى معاذالله عن ذالك
(شرح مسلم مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۳۲)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے کیوں کہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مرادف بھی نہیں، بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ ”واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہئے“ بے خبر نہ تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں:

اذا روينا عن النبى ﷺ فى الحلال والحرام والاحكام شددنا فى الاسانيد وانتقدنا فى الرجال واذا روينا فى الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فى الاسانيد وتسامحنا فى الرجال (فتح المغیث ص ۱۲۰)

جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال و حرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں، تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، لیکن جب فضائل اور ثواب و عقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انکاری کرتے، اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے۔

ابن اسحاق رجل تكتب عنه هذه الاحاديث يعنى المغازى ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هكذا و قبض اصابع يديه الاربع (فتح المغیث ص ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں، لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے چاروں انگلیاں بند کر کے دبالیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ ”حلال و حرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں، لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے“ یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہئے اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے، لیکن واقعہ کی اہمیت احکامِ فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیتِ واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے

کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہئے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے۔

والراوی ان عرف بالفقه والتقدم فی الاجتهاد كالخلفاء الراشدین و العبادلة كان حديثه حجة يترک به القياس خلافا لمالک وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابی هريرة ان وافق حديثه القياس عمل به وان خالفه لم يترک الا بالضرورة .	راوی اگر تفقہ اور اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے، تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا، ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔

(نو الانوار ص ۱۴۷ و ۱۴۸ مطبع علی بخش خاں ۱۲۶۶ھ)

حضرت ابوہریرہؓ کی مثال اگر چہ قابلِ بحث ہے کیوں کہ اکثر علماء کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے: ۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابلِ بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے، اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبویؐ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے (۱) کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلاف الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وان الاخبار التی تشاع ولو كثر ناقلوها ان لم يكن مرجعها الی امر حسّی من مشاهدة اوسماع لا تستلزم الصدق فان جزم	جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضرور نہیں چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ

(۱) صحیح مسلم باب فی الایلاء۔

الانصاری فی روایة بوقوع التطلیق و کذا جزم الناس الذی رآھم عمر عند المنبر بذلک محمول علی انھم شاع بینھم ذالک من شخص بناہ علی التوھم الذی توھمه من اعتزال النبی ﷺ نسائه فظن لکونه لم تجر عادته بذلک انه طلقھن فاشاع انه طلقھن فشاع ذلک فتحدث الناس به واخلق بھذا الذی ابتداء باشاعة ذلک ان یکون من المنافقین کما تقدم.

نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کرلیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہرات سے علٰحدگی اختیار کرلی ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت نہ تھی، اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔

(فتح الباری طبع اول مصر جلد ۹ ص ۲۵۷)

غور کرو، مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں اور سب بیان کررہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کررہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرأت کرکے یہ خیال ظاہر کیا کہ راویِ اول منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہؓ صدیقہ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں، جن میں سے ایک واقعہ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہئے جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا، یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کردیئے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فنِ تاریخ وروایت پر خارجی اسباب کا اثر:

●۸۔ فنِ تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجدِ جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا، سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کردی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس وخاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہ اور عباسیہ

جو ظل اللہ اور جانشینِ پیغمبر تھے اسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں ان کو ہونا چاہئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت ﷺ کے انتقال کے وقت موجود ہوتا، تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے" وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا؟ مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر موثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم ونسق اور تمدن ومعاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف وتصنیف کی ابتداء ہوئی تو یہی نمونے پیشِ نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا، جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ وشاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت وحکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط وخال، تقدس، نزاہت، حلم وکرم، ہمدردیِ عام اور ایثار ہوتا ہے، بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکہ ہوتا ہے، ژرف بیں نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب بنونضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) اربابِ سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے" لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یوں ہی گذر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت: ۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل، یا مسلمات یا دیگر قرائنِ صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گذر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا، عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیانِ روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی، کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لا رتد کثیر ممّن اسلم ولم ینقل ذٰلک.

اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔

حافظ ابن حجر، فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وجمیع ذٰلک لا یتمشّی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجھا دلَّ ذٰلک علی انَّ لھا اصلا (۱)

یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے، اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے مآخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

---

(۱) فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ مصر۔

۲۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا کہ "اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں" علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

فلیس بشیء اذ الحدیث صحیح ثابت ولیس فیه نسبة محض الکذب الی الخلیل و کیف السبیل الی تخطیة الرّاوی مع قوله انی سقیم و بل فعله کبیرهم هذا وعن سارة اختی اذ ظاهر هذه الثلاثة بلا ریب غیر مراد .(۱)

امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث ثابت ہے اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے اور راوی کا تخطیہ کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے اِنِّي سَقِيمٌ اور بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا اور سَارَةُ اُخْتِي کیوں کہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ: ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائلِ عقلی اور قرائنِ حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے اور یہ طریقہ خود صحابہ کرامؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے، اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے" حضرت ابن عباسؓ نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی سے بھی وضو نہ کریں"۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا "بھتیجے جب تم آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو" (۲)

۲۔ صحیح مسلم کے مقدمہ (باب النهی عن الروایة عن الضعفاء الخ ج ۱ ص ۸) میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباسؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور

(۱) قسطلانی جلد ۵ ص ۳۸۹ مطبع مصریہ بولاق۔ (۲) ابن ماجہ باب الوضوء مما غیرت النار ص ۳۸ اصح المطابع دہلی و ترمذی ابواب الطهارة باب الوضوء مما غیرت النار ص ۲۴، دیوبند۔

فرماتے تھے کہ:

واللہ ما قضی بھذا علی الا ان یکون ضلّ — خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اسلئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم (ایضاً) میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لوگ ایک کتاب لائے، جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلم بند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹادی (۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کرلیا کہ وہ صحیح نہیں ہوسکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

۳۔ صحیح بخاری (باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ جلد اص ۱۵۸) میں ہے کہ محمود بن ربیعؓ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص خالصاً خدا کے لئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے گا خدا اس پر آگ حرام کردے گا'' اس جلسہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت ﷺ نے ۷ مہینے تک قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ حدیث سن کر کہا:

واللہ ما اظنّ رسول اللہ ﷺ قال ما قلت قطّ — خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہوگا۔

محمود بن الربیعؓ صحابی تھے اور حضرت ابوایوبؓ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، تاہم چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک قرائن کے خلاف تھی، حضرت ابوایوبؓ اس پر یقین نہ لاسکے اور کہا کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایسا نہ فرمایا ہوگا''۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کرلی لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابوایوبؓ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن الربیعؓ کی روایت میں شبہہ پیدا ہوا، عتبان پر بھی وہی شبہہ پیدا ہوسکتا تھا، حضرت ابوایوبؓ خدانخواستہ محمود کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے، بلکہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہ راوی اول کی نسبت بھی ہوسکتا ہے،

---

(۱) نووی شرح صحیح مسلم (ج ۱ ص ۸۳) میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب ملاطفہ کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے)۔

جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہؓ سے کہا تھا کہ ''تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے''(۱)

۴۔ حضرت عمار بن یاسرؓ نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اتق اللّٰہ یا عمار یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو، چنانچہ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے حضرت ابوموسیٰؓ نے اس روایت سے استدلال کیا تو حضرت عبداللہؓ نے کہاہاں، لیکن عمرؓ کو عمارؓ کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی (۲)

۵۔ حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انہوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل۔ ۱۷: ۵۱) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

۶۔ اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت ﷺ نے کشتگانِ بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ نے غلطی کی (۳) اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے، جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے اور حضرت عائشہؓ کا اجتہاد جس کی بنا پر انہوں نے روایت سے انکار کیا صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابرِ صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

۷۔ ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں، فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں جن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں تو آپؐ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی،

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز ''س'' (باب المیت یعذب ببکاء اھلہ ج ۱ ص ۳۴۳) ''ض''(۲) صحیح مسلم باب التیمم و صحیح بخاری، کتاب التیمم۔ (۳) صحیح مسلم کتاب الجنائز (صفحہ ۳۴۲ و ۳۴۳) میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی، امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا (۱)۔

محدثین اور درایتِ حدیث: صحابہ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

۱۔ ایک ضعیف حدیث ہے کہ ''جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا'' حافظ ابن القیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائلِ عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں:

فلو کان اسناد هذا الحديث کالشمس کان غلطا و وهما (۲) — اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی، تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئی میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ:

اقض بينی وبين هذا الکاذب الآثم الغادر الخائن — میرے اور اس جھوٹے مجرم، دھوکہ باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے۔

چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیئے (۳)، علامہ مازری، اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:

اذا انسدّت طرق تاويلها نسبنا الکذب الی رواتها (۴) — جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

۳۔ بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا، حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الطلاق'' باب المطلقة ثلاثا لا نفقة لها ۔ ج ۱ ص ۵۸۵'' (ض) (۲) زاد المعاد (جزء ثانی) فصل فی هديه ﷺ فی علاج العشق فصل وان کان لا سبيل للعاشق الی وصال معشوقه قدرا و شرعا مطبع نظامی کانپور ص ۹۶۔ (۳) نووی شرح صحیح مسلم ذکر حدیث مذکور ج ۱۲ ص ۷۲ مطبع مصریہ از ہر ۱۹۳۰ء۔ (۴) نووی شرح صحیح مسلم کتاب الجہاد باب حکم الفئی ایضاً۔

ویشکل علی هذا مایوجد الآن من آثار الامم السالفة کدیار ثمود فانّ مساکنهم تدلّ علی ان قاماتهم لم تکن مفرطة الطول علی حسبما یقتضیه الترتیب السابق .... ولم یظهرلی الی الآن مایزیل هذا الا شکال (۱)	اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے ------ اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

۴۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد استشکل الا سماعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته (۲)	اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فنِ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہو، لیکن قابل لحاظ ہوسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

۵۔ عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگ سار کیا، حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلّف نہیں، اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہوسکتا ہے نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جاسکتی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد استنکر ابن عبدالبر قصة عمرو بن میمون هذه وقال فیها اضافة الزنا الی غیر مکلف واقامة الحد علی البهائم (۳)	ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ''اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے''۔

---

(۱) فتح الباری مطبوعہ مصر، جلد ۶ ص ۲۶۰ کتاب بدء الخلق۔ (۲) فتح الباری مطبوعہ مصر، جلد ۸ ص ۳۸۴ کتاب التفسیر سورۃ الشعراء۔ (۳) فتح الباری مطبوعہ مصر، جلد ۷ ص ۱۲۲ باب ایام الجاهلیة۔

۶۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک (۱) دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرف داروں اور آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں جھگڑا ہوگیا، اس پہ یہ آیت اتری:

وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (حجرات۔ ۴۹ : ۹) — اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرادو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطّال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیتِ قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں اور یہاں عبداللہ ابن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا (۲)۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

روایت بالمعنی: ۱۰۔ ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنی کا ہے، یعنی آنحضرت ﷺ نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمیر، ابوزرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے (۳) لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کرسکتے تھے اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے، ہم نے محض خلاصہ ذکر کردیا ہے (کتاب العلم سہواً یا کتابت کی غلطی ہے، یہ روایت کتاب الصلح باب ما جاء فی الاصلاح بین الناس کی ہے، ج ۱ ص ۳۷۰) "ض"۔ (۲) فتح الباری ج ۵ ص ۲۱۹۔ (۳) صحیح ترمذی کتاب العلل (ج ۲ ص ۲۳۶) "ض" میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصد قونی ، انما ھو المعنی (۱)

اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہ وہی ادا کر دیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کیے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا تھا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ ''آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا''۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گیا تو دفعتاً سر جھکا لیا، پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں، قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یوں کہا یا یوں یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ ''آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا'' امام شعبی کہتے ہیں کہ ''میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا''، سائب بن یزید کہتے ہیں کہ ''میں نے سعد بن مالکؓ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت ﷺ سے روایت نہیں کی'' (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ ''میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا'' انہوں نے کہا ''میں جب سے اسلام لایا میں نے کبھی آنحضرت ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے'' (۲)

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا:

ایّا کم وکثرۃ الحدیث عنّی (۳)

خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو

(۱) صحیح ترمذی کتاب العلل ج ۲ ص ۲۳۵۔ (۲) یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں، دیکھو ص ۴ و ۵ مطبوعہ اصح المطابع دہلی۔ (۳) (دیباچہ) ابن ماجہ ص ۵۔

تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلبِ روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر انکار کیا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ صدیقہ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی:

ان المیت لیعذب ببکاء الحی — مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ (۱) — تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا:

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطا (۲) — ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

روایت احاد: ۱۱۔ ایک اور بحث روایت احاد کی ہے، روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا مؤید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایاتِ احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ درحقیقت انکارِ بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ ''زید تم کو بلاتا ہے'' اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرز عمل اس کے مخالف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا اور واپسی کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ''۔ حضرت عمرؓ نے کہا ''اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا''۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز (ج اول ص ۳۴۳) ''ض''۔ (۲) مسلم کتاب الجنائز (ایضاً ص ۳۴۴) ''ض''۔

حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں اور نہ آنحضرت ﷺ سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے، مغیرہ بن شعبہؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔

(اسی بناپر روایتِ احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدمِ اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے" تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ایک بار سپید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے"۔ (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائجِ مباحث مذکورہ: گذشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابہ کبار کا جو طرزِ عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقد و حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں

بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

ا۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیثِ صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہئے، اگر نہ ملے تو روایاتِ سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

۲۔ کتبِ سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورتِ اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواتِ اربابِ فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

۵۔ سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

۶۔ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہئے۔

۷۔ روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزء شامل ہے۔

۸۔ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟۔

۹۔ جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصولِ مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائقِ حجت نہ ہوگی۔

۱۰۔ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

۱۱۔ روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہئے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آ سکتا ہے کہ اسلامی فنِ روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیحِ روایت کے لئے کتنی محنت و جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتناء کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبر اسلامؐ میں سے کسی نے بھی اس جاں کاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟)(۱)

---

(۱) زیادت از صفحہ ۵۷ تا ۵۸ ”س“

یورپین تصنیفات

آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی، جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں کیوں کہ اس حصہ میں بھی ہم کو جا بجا ان تصنیفات سے کام لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی پیغمبر اسلامؐ سے ابتدائی واقفیت: یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

> ''عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی، لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منھ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے''(۱)

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

---

(۱) محمڈ اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ (ص ۶۳) Bosworth Smith : Mohammad & Mohammadanism P 63

’’وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ سے رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یا مافومیڈ (یعنی محامد) اور اپلین اور تیسرا ٹرماگان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے ’’اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڈھے میں ڈال دیا، اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی اور از سرِ نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہم راہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔

ایک دوسرا شاعر ریچ خدا سے دعا کرتا ہے کہ ’’وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے‘‘ اس کے بعد وہ امرا کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے۔ ’’اٹھو اور

ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو، اور ان کو آگ میں ڈال دو اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کرو'' (۱)

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی: سترہویں صدی کے سنین وسطی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جدوجہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیتِ اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخِ اسلام و سیرتِ پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس (Arp) مارگولیتھ (Margoliouth) ایڈورڈ پوکاک (Pococke) اور ہاٹنجر (Hattinjer) ذکر کے قابل ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں، جو قرونِ ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے، یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطینِ مصر کا ایک درباری تھا اور ابوالفرج بن العبری الملطی

(۱) ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بہ زبان عربی مطبوعہ مصر از ص ۸ تا ۱۰۔

المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولتِ اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی: یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوتِ سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے ''اورینٹلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے اور نیٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بہ مقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کاران مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالکِ یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، سب سے پہلے رسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی، ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے میتھوس (A.N.Mathews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی کوٹنگن (Cottingen)

سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G. Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی، ولہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاؤٹسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی، ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J.Barth) اور نولدیکی (Noldeke) وغیرہ نے شائع کی اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرتِ نبویؐ میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفینِ تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے :

''محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے(۱)

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں جو بہ تخصیص آنحضرت ﷺ کے حالات میں یا اسلام کے اصولِ عقائد پر لکھی گئیں اور جن میں سے اکثر ہمارے دفترِ تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱۔	ڈاکٹر جی بی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء

(۱) مارگولیتھ، محمد ''دیباچہ'' صفحہ ۱۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۲۔	ڈاکٹر وایٹ (White) واعظ اوکسفورڈ	انگلستان	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر	اوائل ۱۸۰۰ء
۳۔	گارڈ فری ہگنس ایم، آر، اے، ایس (Godfrey Higgins)	,,	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴۔	ڈاکٹر جے اے، مولر (Muller)	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵۔	گارسن ڈی ٹاسی (Garcin De Tossy)	فرانس	اسلام و قرآن	از ۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۴ء
۶۔	ایڈورڈ لین (Edward Lane)	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷۔	ڈاکٹر ویل (Weil)	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد پیغمبرؐ	۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء
۸۔	کارلائل (Corlyle)	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو وورشپ	۱۸۴۶ء
۹۔	کوسن ڈی برسیوال (Caussin De Perseeval)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰۔	واشنگٹن اروِنگ (W.Irving)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۴۹ء
۱۱۔	ڈاکٹر اسپرنگر (Springer)	جرمن	سیرت محمدؐ	۱۸۵۱ء
۱۲۔	وان کریمر (VonKremer)	,,	ترجمہ و تحشیہ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳۔	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمدؐ"	۱۸۵۸ء
۱۴۔	ڈوزی (Dozy)	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵۔	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء
۱۶۔	ڈی لین (De Lane)		سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۷۔	میور (Muir)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۸۔	برتھالمی سینٹ ہلیر (Hilaire)	فرانس	محمد و قرآن	۱۸۶۵ء
۱۹۔	نولدیکی (Noldeky)	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	۱۸۶۹ء
۲۰۔	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱۔	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	,,	محمدؐ	۱۸۷۲ء
۲۲۔	جولیس چارلس (Julius Charles)	فرانس	تاریخ بانی اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳۔	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۴۔	باسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith)	,,	,, ,,	,,

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۲۵۔	سیدیو (Sedillot)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶۔	ولہوسن (Wellhousen)	جرمن	تبصرہ برواقدی	۱۸۸۲ء
۲۷۔	اہل کرابل (Krehl)	جرمنی	سیرت محمدؐ	۱۸۸۴ء
۲۸۔	گولڈزیہر (Goldziher)	،،	مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹۔	رینان (Renan)	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰۔	ایچ گریم (Grimme)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۸۹۴ء
۳۱۔	ہنری دی کاستری (Henr y deCastry)	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲۔	ایف بوہل (Buhl)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۹۰۳ء
۳۳۔	والسٹن (Wallaston)	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴۔	مارگولیتھ (Margoliouth)	،،	محمدؐ	،،
۳۵۔	کوئل (Koell)	،،	محمدؐ اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶۔	پرنس کائتانی (Caetani)	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمدؐ و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷۔	میجر لیونارڈ (Leonard)	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنّفینِ یورپ کی تین قسمیں: مصنّفینِ یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں، لیکن قلیل ماھم۔

۲۔ عربی زبان اور علمِ ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلامؑ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل سخاؤ جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کی وسعتِ معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کرسکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا

دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلو پیڈیا (جلد ١٦) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

٣۔ وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولیتھ صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ: ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند امام احمد بن حنبل کی ٦ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعوی نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افتراء اور تاویل و تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گذری ہے، حافظ ابن حجر کی **کتاب الاصابۃ فی احوال الصحابہ**، اول اول ان ہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی، لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ٣ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ (١)

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب: یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں، جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

(١) یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کئے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گذرے ہیں۔

ا۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازیِ واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفاتِ سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گذر چکی ہے، مصنفینِ سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف، سرّی، ابن سلمہ ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہوسکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لئے یہ سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیتھ) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمنِ معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائنِ موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

بہ خلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفترِ تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے

خلاف ہواور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلافِ اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلوماتِ عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرور ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ خود بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصولِ مشترکہ: یورپین مصنفین، آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ میں جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خوں ریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ کثرتِ ازدواج اور میل الی النساء۔

۳۔ مذہب کی اشاعت جبر و زور سے۔

۴۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

۵۔ دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہئے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں ۔

اس کتاب کی تصنیف وترتیب کے اصول: ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آ گیا ہے۔

ا۔ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیاتِ قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

۲۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اربابِ سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتبِ حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہئے اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں، اس لئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاحِ ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے، جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

۳۔ روز مرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کدوکاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح وتعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہو جائے۔

۴۔ جن فروگذاشتوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے: اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات وغزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت ﷺ کے ذاتی اخلاق وعادات کی تفصیل ہے، آل واولاد اور ازواج مطہراتؓ کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر ونواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر ونواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق وعادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیوں کر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہِ اعجاز اور حقائق واسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آگئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیرِ طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیوں کر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ

کے اخلاق وعادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے: تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں۔

۱۔ صرف ان ہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گذری ہیں۔

۲۔ جو واقعات کسی قدر اہم ہیں ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے، لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کدوکاوش نہیں کی ہے۔

۳۔ مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گذر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کون سا نسخہ تھا۔

﴿ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ﴾

عرب

وجہ تسمیہ: عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو ''عرب'' اور دنیا کی تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔

ورجّت باحۃ العربات رجّا ترقرق فی مناکبھا الدماء

وعربۃ ارض جدّ فی الشر اھلھا کما جدّ فی شرب النّقاخ ظماء

وعربۃ دار لا ما یحل حرامھا من الناس الا اللوذعی الحلاحل (۱)

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے، اس لئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ: عرب کے حدودِ اربعہ یہ ہیں:

مغرب۔ بحیرۂ قلزم

مشرق۔ خلیج فارس اور بحر عمان

جنوب۔ بحر ہند

شمال۔ کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

---

(۱) معجم البلدان ج ۶ لفظ عربۃ و عربات ص ۱۳۷ تا ۱۴۰ مصر ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفینِ عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں، لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو (۶۰۰) میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فیٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے ''صفۃ جزیرۃ العرب'' میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مورخین نے لکھا ہے زیادہ تر ان کا مالِ تجارت چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر ایک خاص کتاب لکھی ہے۔(۱)

قدیم تاریخ کے ماخذ: اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

۱۔ زمانۂ جاہلیت کی بعض تصنیفات، جو سلاطین حیرہ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامۂ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

۲۔ زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعارِ جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں، مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مورخینِ اسلام عرب کی تاریخِ قدیم پر معتد بہ تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تابعۂ یمن اور دیگر سلاطین عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے۔

۳۔ اشعارِ جاہلیت، جن میں اکثر سلاطین اور اقوام اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی

---

(۱) Gold Mines of median

نے اپنی کتاب ''اکلیل''(۱) مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثارِ قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

۴۔ یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفینِ یونان نے تھیوفراسٹس (جو حضرت عیسیٰؑ سے چارسو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائلِ عرب کے نام لکھے ہیں اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

۵۔ عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے اور جو آج کل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

عرب کے اقوام وقبائل: (مورخینِ عرب (۲) نے اقوام وقبائلِ عرب کو تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔

عربِ بائدہ یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عربِ عاربہ بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملکِ یمن تھا۔

عربِ مستعربہ بنو اسمٰعیل یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسمٰعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل وفروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر قطعۂ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر ان کے نام آئیں گے اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے:

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں۔

---

(۱) اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعہ بیروت ۱۹۱۲ء) میں ہے (دیکھئے ص ۱۸ و ۴۲ و ۵۸۔ ''ض'')

(۲) یہاں سے ''عرب کی قدیم حکومتیں'' سے پہلے تک زیادت ہے۔ ''س''۔

۱۔قضاعہ۲۔کہلان ۳۔ازد،حمیر بھی اسی کی شاخ ہے جو یمن کے فرماں روا تھے لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۔قبائلِ قضاعہ: عام علمائے انساب قضاعہ کو بنوقحطان میں داخل کرتے ہیں اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں ورنہ از روئے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں، بہر حال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں:

بنوکلب، بنوتنوخ، بنوجرم، بنوجہینہ، بنونہد، بنوعذرہ، بنواسلم، بلی، سلیح، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب۔

۲۔کہلان۔

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

۳۔ازد، انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں، قبائلِ مضر اولاً بنی خندف اور بنوقیس دو خاندانوں پر منقسم ہیں۔

۱۔خندف

ہذیل، کنانہ، اسد، ضبۃ، مزینہ، رباب، تمیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع
کنانہ	قریش، دول
ہون	قارہ
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب

۲۔قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں۔

غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ
اعصر	غنی، باہلہ
ہوازن	سعد، نصر، جیشم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں، بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ

بنو قحطان و آلِ اسمٰعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں۔

عرب کی قدیم حکومتیں: کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گذریں۔

۱۔ مَعینی	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے، جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔
۲۔ سبائی	یعنی قومِ سبا۔
۳۔ حضرموتی	حضرموت، یمن کا مشہور مقام ہے۔
۴۔ قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے، جو آج کل گمنام ہے۔
۵۔ نابتی	حضرت اسمٰعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے، محققینِ یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر، گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیحؑ سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایۂ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایۂ تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرماں روا گذرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ وسال بھی کندہ ہے، ان کے عہدِ حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہونچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہوگیا(۱)۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کرلیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آج کل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:

”رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل ورحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو بادشاہ حبش اراحمیس ذبی مان کا نائب الحکومۃ ہے“۔

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعتِ فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں، عربوں کے خیال کے موافق سلاطینِ حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کرلئے تھے، ذوالقرنین، جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہلِ عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا، شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کرلیا تھا، علامہ ثعالبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہوگئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران حمیر کا بادشاہ تھا اور ہاماوران دراصل وہی

(۱) یہ تمام تفصیل انسائیکلوپیڈیا کے اس آرٹکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے، نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس، مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ تا ۶۔

عربی لفظ حمیر ہے، علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاوش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقاتِ حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:

''ولادت مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارشِ گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے اور اہل یونان و روم نے اس کو ''دولت مند عرب'' کا جو لقب دیا تھا وہ بے جا نہ تھا۔۔۔۔۔۔ توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ ملکۂ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے، (۱۔سلاطین ۱۰، آیت ۱ تا ۱۰) قوم ثمود، جن کی عمارات سے ڈاوٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً ان ہی سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا'' (۱)

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی اور جو قوم ثمود کی مرادف یا ان کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:

''ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانۂ قدیم میں نابت کا نام اور اثر

(۱) مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸، یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف ورلڈ، تمہیدی آرٹکل نوشتہ پروفیسر نولدیکی صفحہ ۵۔

نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا، بلکہ حجاز ونجد کے صوبہ ہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا، نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور سچے بنو اسماعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین و شام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی نے بارہا تاج دارانِ مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا، لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شئے انہیں روک نہ سکی اور روما کی اطاعت بھی انہوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی''۔(۱)

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، ان کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہتے تھے، عراق میں آلِ منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھا، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرماں روا تھا جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا اور جس کا اخیر فرماں روا جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب وتمدن: تہذیب وتمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے، مانسیو لیبان (۲) فرنساوی نے اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچ چکا تھا، کیوں کہ اصولِ ارتقاء کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب وتمدن تک نہیں پہنچ سکتی''۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققینِ آثارِ قدیمہ جنہوں نے یمن کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی ہے اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور قلیس کے ذکر میں یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثارات عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے

(۱) تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸۔ (۲) تمدن عرب (کتاب اول باب سوم فصل سوم ص ۸۳تا۸۸)

اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے، تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایۂ تخت تھا اور حوران جو خاندانِ غسان کا صدر مقام تھا تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے۔

مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کرلیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں بھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثارِ قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب (۱) میں لکھتے ہیں۔

المشهور من محافد اليمن و قصورها القديمة التى ذكرتها العرب فى الشعر والمثل .... كثيرة الذى فيها من الشعر باب واسع وقد جمع ذلك كله الكتاب الثامن من الا كليل	یمن کے مشہور قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر اہلِ عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ کثرت سے ہیں اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف ان کے نام گنا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں:

غمدان ، تلفم ، ناعط ، صرواح ، سلحين، ظفار ، هكر ، ضهر ، شبام ، غيمان ، بينون، ريام ، براقش ، معين ، روثان ، ارياب ،هند ، هنيده ، عمران ، نجير .

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال، معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے، سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا (۲) شبام کے حال میں لکھا ہے:

لهم فيه حصون عجيبة هائلة (۳)	اس میں ان کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں۔

قلعہ ناعط وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے

(۱) (ج ۱ ص ۲۰۳) ''س'' (۲) جلد ۵ ص ۱۰۵۔ (۳) ایضاً ص ۲۲۶۔

پڑھا تو معلوم ہوا کہ ۱۶۰۰ برس کی تعمیر ہے، آج کل یورپ کے محققین نے ان مقامات پر جا کر جو تحقیقات کی ہے اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹکل میں لکھتے ہیں (۱):

''جنوبی عربستان میں جہاں حضرت عیسیٰ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا، قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے ـــــــ یمن اور حضرموت میں یہ آثار کثرت سے ہیں اور اکثروں پر اب تک کتبے موجود ہیں ـــــــ صنعاء کے قریب ایک قلعہ تھا، جسکو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے (دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جنرل جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد ا صفحہ ۲۰ سے آگے)''

مارب جو قدیم سبائی دارالسلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ، کوارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

''مارب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی، جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم وششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے''۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب وتمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں، درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے، چراغ معمولی چیز ہے، تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا مصباح یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنالی

(۱) دیکھو انسائیکلوپیڈیا مضمون ''عرب''۔

جاتی ہے، کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کرلیا ہے، لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کرلیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، یہ وہی کاسہ فارسی لفظ ہے، کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پائجامہ کو سروال کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی، آس پاس کے ممالک کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوکر کی تھی، اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک عیش ونعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شانِ نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی، مستورات رفعِ حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کراڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں تھا، لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض (۱) کا حرام ہونا نہیں سنا (۲) اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت ﷺ نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب میں بہ تصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوہ، گرگٹ، سہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب: عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

---

(۱) حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔ (۲) ابوداؤد جلد دوم صفحہ (۱۷۶) باب فی اکل حشرات الارض (کتاب الاطعمہ ص۵۳۲ طبع دیوبند)

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَىٰ وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ۔۴۵ : ۲۴)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا وسزا کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین۔۳۶ : ۷۹)

کہہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

بعض خدا اور جزا وسزا کے بھی قائل تھے، لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَقَالُوا مَا لِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (فرقان۔ ۲۵ : ۷)

اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔

قَالُوا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل۔۱۷ : ۹۴) کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہئے، جو حاجاتِ انسانی سے منزہ ہو۔

لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں (۱)۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ (زمر۔۳۹ : ۳)

ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلۂ حمیر جو یمن میں رہتا تھا، آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلۂ بنی تمیم، دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس شعریٰ کی، قبیلۂ اسد عطارد کی اور لخم وجذام، مشتری کی پرستش کرتے تھے (۲)۔

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں: (۳)

---

(۱) یہ تمام تفصیل ''ملل ونحل'' شہرستانی مذاہب عرب کے ذکر میں ہے (برحاشیہ الفصل فی الملل والنحل ابن حزم باب آراء العرب فی الجاهلية ج ۳ ص ۲۲۰ ''ض'') (۲) طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی، مطبوعہ بیروت ۱۹۱۲ء ص ۴۳۔ (۳) بتوں کی تفصیل ''ملل ونحل'' میں ہے۔ (ج ۳ ص ۲۲۲ برحاشیہ ملل ونحل ابن حزم)

نام بت	مقام	قبیلہ جواس بت کو پوجتا تھا
لات	طائف	ثقیف
عزیٰ	مکہ معظّمہ	قریش و کنانہ
منات	مدینہ منورہ	اوس، خزرج اور غسّان
ودّ	دومۃ الجندل	کلب
سواع	.	ہذیل
یغوث		مذحج اور بعض قبائلِ یمن
یعوق		ہمدان

سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا، اس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلۂ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہو گیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو، انہوں نے کہا کہ یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہو گیا، ان میں سب سے قدیم بت منات تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے(۱)۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائلِ عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

(۱) یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے (دیکھئے جلد ۸ ص ۱۶۷ و ۱۶۸ ''ض'')۔

اللہ کا اعتقاد: عرب گوقریباً سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے اور وہی تمام عالم کا خالق ہے، اس خالقِ اکبر کو وہ "اللہ" کہتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ . (عنکبوت۔ ۲۹ : ۶۱)	اور ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کس نے تابع دار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ "اللہ" پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں۔
فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ . (عنکبوت۔ ۲۹ : ۶۵)	پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقات آثار قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب واخلاق کی انسائیکلو پیڈیا (۱) میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

"اللّٰہ" جو صفا کے کتبوں میں "ھلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگانِ عرب مالی کے نام کا ایک جزء تھا، مثلاً "۔۔۔زید اللّٰہی" ۔۔۔۔۔نباتی کتبات میں اللّٰہ کا نام بطور ایک علحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللّٰہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں، بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا"۔

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت: اگرچہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے، لیکن یہ

---

(۱) جلد ا ص ۶۶۴۔

تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائل ربیعہ وغسان نصرانی تھے، قضاعۃ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنہوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پالیا تھا اور توراۃ کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدراس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امرءالقیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت ﷺ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (نحل۔۱۶ : ۱۰۳)	اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلۂ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا (۱)۔

مذہب حنفی: دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانہ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحبِ بصیرت تھے ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل، جماد لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ

---

(۱) معارف ابن قتیبہ (ادیان العرب فی الجاہلیۃ ص ۲۶۶ المطبعۃ الاسلامیہ مصر: الازہر ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء "ض")۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے، ابن اسحاق (۱) نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعتاً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کرسکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے، عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید، دینِ ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ ''میں ابراہیمؑ کا مذہب قبول کرتا ہوں''۔ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، ''اے اہلِ قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے''۔

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی، ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا، بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے، تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیسِ مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا اور نہایت پر درد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کرسکا۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر جلد اول ص ۷۶۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کے ہم ردیف تھے، انہوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اور'' انہوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپؐ فرماتے جاتے تھے کہ ''اور'' اخیر میں آپؐ نے فرمایا کہ ''امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا''۔

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں ان ہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہو گئے تھے، جنہوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص عرب کا نامور خطیب قس بن ساعدۃ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو حنفی کیوں کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لئے اس کو حنفی کہتے ہیں، کیوں کہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی (۱) زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بت پرستی کے منکر ہو گئے تھے اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجدد ملتِ ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفینِ یورپ کہتے ہیں کہ مذہبِ صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی: جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنفیت بھی اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت،

(۱) یہ مارگولیتھ کا بیان ہے۔

جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کرسکی، اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا (۱)۔

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خواری، زنا کاری کا رواج عام تھا، بے حیائی کی یہ حالت کہ سب سے بڑا نامور شاعر امرء القیس جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا، تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اسکو خود عیسائی مورخین کی زبان سے سننا چاہئے! ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے:

> ''عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس تعلیم و تلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے، یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت ـــــ بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھئے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا''۔(۲)

یہ حالت عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالم گیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتابِ عالم تاب کی حاجت نہ تھی؟

---

(۱) توراۃ تکوین (باب ۳۲ ''ض'') آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوبؑ کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔
(۲) میور صاحب کی لائف آف محمدؐ جلد ۱، دیباچہ۔

سلسلۂ اسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مورخینِ عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہوگئیں، مثلاً طسم وجدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً اہلِ یمن اور انصار (اور تیسرا سلسلۂ اسماعیلی)۔

حضرت اسماعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسماعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی، اس سے جو اولاد ہوئی وہ عربِ مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوئی، وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (وَفِیْ هٰذَا) (حج۔ ۲۲ : ۷۸)

تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی (۱) نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا، (اور اس قرآن میں بھی)۔

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مورخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں، یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ عرب میں آئے، نہ انہوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

(۱) (اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے، جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے۔) "س"۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں، اصولِ مذکورہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ عرب میں آ کر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسماعیلؑ کو؟

حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے؟: یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہیں اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحٰقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائیں گی۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے ہوئی، جس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا، حضرت اسماعیلؑ کے بعد حضرت سارہؓ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے، حضرت اسماعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہؓ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہؓ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو، ان واقعات کے بعد توراۃ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

''تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہؓ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی، کیوں کہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہؓ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہؓ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں

دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملکِ مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی"۔

(توراۃ سفر پیدائش باب (۲۱ آیت ۱۴ تا ۲۱ "ض")

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے چنانچہ حضرت ہاجرہؓ نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی تورات میں صاف یہ الفاظ ہیں:

واضعا ایاھا علی کتفھا والولد — حضرت ابراہیمؑ نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہؓ کے کندھے پر رکھا۔

لیکن توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی (۱) اور جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیل کا ختنہ کیا تو حضرت اسماعیل کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیمؑ کی ۹۹ برس کی تھی (۲)۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لئے اس وقت قطعاً ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی دور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

توراۃ کی عبارت مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسماعیلؑ کا عرب میں آنا خلافِ واقعہ ہے۔

جغرافیہ دانانِ عرب عموماً متفق ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے، جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حدودِ شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

(۱) پیدائش باب ۱۶۔۱۶۔ (۲) پیدائش باب ۱۷۔۲۴۔۲۵۔

موسیو لیبان تمدن عرب میں لکھتے ہیں:

''اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیجِ فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں''۔

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلافِ قیاس نہیں، توراۃ (۱) میں جہاں حضرت اسماعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:

''اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے''۔

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے، نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے، بنی اسماعیلؑ کا ذکر محض ضمنی طور پر آ جاتا ہے اور اس وجہ سے حضرت اسماعیلؑ کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا، لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلمہ امر تھا، عہد جدید میں جس کو عیسائی وحیِ الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے (۲)۔

''ابراہیم کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا، جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے، کیوں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے''۔

اگر چہ معلوم نہیں اصلی عبارت کیا تھی، اردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس

---

(۱) سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ ص ۳۹ آکسفورڈ۔ (۲) باب ۴ آیت ۲۲ تا ۲۵ ص ۳۰۹۔

قدر واضح ہے کہ پولوس جو حضرت عیسیٰ کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہؑ کو عرب کا کوہِ سینا کہتے تھے، اگر حضرت ہاجرہؑ عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں تو ان کو عرب کا کوہ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے، آگے چل کر بکہ کے ذکر میں یہ بحث زیادہ موید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟: توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراضِ ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہوگئی ہے اور خصوصاً پیغمبرِ خاتم ﷺ کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کے دستِ تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے، تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحٰقؑ کا ذبیح ہونا لکھا ہے، لیکن مطاویِ کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے، امورِ ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۱۔ شریعت سابقہ کے رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلونٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰؑ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے، وہاں فرمایا ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبهائم	کیوں کہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔ (عدد ۸۔۱۷)

۲۔ پہلونٹے بچہ کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد کو ہوگی جو پہلونٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانه اول قدرته وله حق البكورية	کیوں کہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو اولادِ اولین ہونے کا حق ہے۔ (سفر تثنیہ، اصحاح ۲۱ آیت ۱۷)

۳۔ جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا، توراۃ میں ہے:

فی ذلک الوقت افرز الرب سبط لاوی ليحملوا تابوت عهد الرب ولكی يقفوا امام الرب ليخدموه ويبار كوا باسمه الی هذا اليوم لاجل ذلک لم يكن للاوی قسم ولا نصيب مع اخوته الرّب هو نصيبه. (توراۃ، تثنیہ، اصحاح ۱۰ آیت ۸ و ۹)	تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو، تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیوں کہ ان کا حصہ خدا ہے۔

۴۔ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، توراۃ میں ہے:

فھا انک تحملین و تلدین ابنا ولا یعل موسی راسه لان الصبی یکون نذراً للّٰه	اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے، کیوں کہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

(توراۃ، قضاۃ، اصحاح ۱۳۔۴)

۵۔ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لئے ''خدا کے سامنے'' کا لفظ استعمال کرتے تھے (توراۃ سفر عدد ۶۔۱۶ و ۲۰ و سفر تکوین ۲۷۔۷ و تثنیہ ۱۰۔۸)۔

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو (توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۲)۔

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے؟

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، توراۃ میں خدا کی زبان سے مذکور ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبھائم	کیوں کہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔

(عدد اصحاح ۸۔۱۷)

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ ''خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو، اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو کہ خدا کے لئے خاص کر دیئے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں، جو قربانی کی جائیں۔ (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا، اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیانِ مذکورہ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

ا۔ حضرت اسحٰق ؑ کی ولادت حضرت اسماعیلؑ کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحٰق ؑ اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے اس لئے حضرت اسحٰق ؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ حضرت اسحٰق ؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا، بہ خلاف اس کے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰق ؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

۳۔ حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنتِ اسماعیلی کی یادگار ہے۔

۴۔ جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملتِ ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے لئے استعمال کئے نہ کہ حضرت اسحٰق ؑ کے لئے، توراۃ میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰق ؑ کی ولادت کی خوش خبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا :

لیت اسمعیل یعیش امامک (تکوین باب ۱۷ آیت ۱۸) کاش اسماعیلؑ تیرے سامنے زندہ رہتا ۔

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔

۵۔ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے، توراۃ جو تمام تر حضرت اسحٰق ؑ کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحٰق ؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحٰق ؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں (۱) اور حضرت اسماعیلؑ دعوتِ ابراہیم ہیں، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے (۲) اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسماعیل رکھا، کیوں کہ اسماعیلؑ دو لفظوں سے مرکب ہے سمع اور ایل "سمع" کے معنی "سننے" کے اور "ایل" کے معنی "خدا" کے ہیں (۳) یعنی خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا "سن لی" توراۃ میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "اسماعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی"۔ حضرت ابراہیمؑ کو

(۱) توراۃ تکوین ۱۷۔ ۱۹ و ۲۱۔ (۲) تکوین اصحاح ۱۵ (۱۷۔ ۲۰ "ض") (۳) (تکوین اصحاح ۱۷ و ۱۸)

جب خدا نے حضرت اسحٰقؑ کی خوش خبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسماعیلؑ کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لئے حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔

۶۔ حضرت اسحٰقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، توراۃ میں ہے:

''پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحٰقؑ رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا''۔

(توراۃ تکوین اصحاح ۱۷ آیت ۷ و ۱۹)۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ روک لو، تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے:

''خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا''۔

(توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۱۶ و ۱۷)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحٰقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحٰقؑ (۱) کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی، ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسماعیلؑ اکبرِ اولاد تھے، محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرتِ نسل کی بشارت نہیں دی گئی، توراۃ میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرتِ نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرتِ نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیوں کہ حضرت اسحٰقؑ کی تکثیرِ نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام و صلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

(۱) یہ مسلم ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد، حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی، (تکوین، اصحاح ۲۵ آیت ۱۱)

مقام قربانی: ۷۔ توراۃ میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا ہے وہ ''مریا'' ہے، یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں، یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔

لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعوؤں کی تغلیط کی ہے، سر اسٹانلی لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا، لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے اور اس سے بھی زیادہ ابعد مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبلِ عرفات (۱) ہے، غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے''۔

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعویٰ غلط ہیں، باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے اور ایک اختلاف پیدا کر دیا، یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا اور اس لئے اس کا ترجمہ توراۃ کے بعض نسخوں میں بلوطاتِ عالیہ اور بعض میں ''زمین بلند'' اور بعض میں مقام الرویا کیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لِفظ کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ بحال خود رہنے دیا، لیکن امتدادِ زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی یعنی مریا کا مورہ ہو گیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، توراۃ میں ہے:

وکان جیش المدیانیین شمالیھم عند تلّ مورۃ فی الوادی (قضاۃ۔اصحاح ۷ آیت ۔۲)	اور مدیانیوں (۲) کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔ (مدیان عرب میں واقع ہے)

(۱) یہ غلط ہے، مسلمان عرفات کو نہیں بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔ (۲) مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیون کہتے ہیں اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، جو قطورا سے تھے (ضمیمہ بائبل ص ۱۱۴)۔

تمام واقعات اور قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے، جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحتِ واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں'' ۔(۱)۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت ﷺ نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے:

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (حج۔۲۲:۳۳) پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔

هَدْيًا ۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ۔۵ :۹۵) قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے ۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار: یہودی حضرت اسحٰقؑ کی اولاد ہیں، اس لئے اگر اسحٰقؑ ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے یہاں موجود ہوتی ، بخلاف اس کے حضرت اسماعیلؑ کے خاندان ، بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسماعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولادِ اسماعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیمؑ نے کہا ''میں حاضر ہوں'' (۲)۔

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ وہی ہے ''میں حاضر ہوں'' (۳)۔

---

(۱) موطا امام مالک ''کتاب الحج باب ما جاء فی النحر فی الحج ص ۱۵۳۔ (۲) توراۃ تکوین اصحاح ۲۲ آیت ۱۔

(۳) توراۃ ،لاویین ،اصحاح ۸ آیت ۲۷۔

۲۔ شریعتِ ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے، یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

۳۔ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں، تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے:

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ (فتح۔۴۸ : ۲۷) سروں کو منڈائے ہوئے۔

۴۔ حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صٰفّٰت۔۳۷ : ۱۰۷) اور حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی۔

یہ دلائل توراۃ کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ . فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىْٓ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى الخ

(صٰفّٰت۔۳۷ :۹۹تا۱۰۲)

اور حضرت ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا، وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو تو ہم نے اس کو ایک سمجھ دار لڑکے کی خوش خبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم نے کہا بیٹے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے، الخ۔

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

توراۃ سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں اور اسی لئے ان کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارہ میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں، اسحٰقؑ نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا، قرآن مجید میں ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ　　تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا(۱)۔　　(حج۔۲۲ : ۷۸)

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ ''مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمہاری کیا رائے ہے''؟ تو حضرت اسماعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے ''اَسْلَمَا'' کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی ''تسلیم'' اور ''حوالہ کر دینے'' کے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا　　پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔　　(صٰفّٰت۔۳۷ : ۱۰۳)

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے، یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبولِ بارگاہ ہوا اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا یہی شعارِ مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحٰقؑ قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت: اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا

[(۱) ابھی ص ۹۰ کے حاشیہ میں گذر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قربِ لفظ کی وجہ سے سَمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا ہے، تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابو حیان نے اسی کی تائید کی ہے (البحر المحیط جزء سادس ص ۳۹۱) لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ اور تابعین میں مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سفیان نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے اور یہ معنی لئے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں اس نے تمہارا یہ نام رکھا، تفسیر ابن جریر جزء سابع عشر ص ۱۳۰۔] ''س''

جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھادیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفینِ اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا، لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابر صوفیہ(۱) نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے

---

(۱) اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رویا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورتِ واقعہ بعینہٖ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورتِ واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علما نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے خواب کی اس دوسری قسم میں اصلی مقصود رویا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا، یا حضور انور ﷺ کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا اور احد میں مسلمان شہداء کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا۔

محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:

وبعض الرویا مثل یضرب لیتاؤل علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرویا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاھدۃ (فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۰۲)

بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جس کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ "بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل گنتیوں کی طرح ہوتے ہیں، یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا، (احکام القرآن جلد ۲ ص ۱۹۶ مطبع سعادت، مصر ۱۳۳۱ھ)

مصنفِ سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا اور حضرت اسماعیلؑ کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔

ہیچ مداں جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبتِ الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوقِ اطاعت و محبت میں اس حکمِ الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ اس ابتلاء میں (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۳ پر)

ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے، تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، توراۃ میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاءؑ سے ہو سکتی تھی (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیمؑ اس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (صٰفّٰت۔ ۳۷ : ۱۰۵) تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں

بہر حال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمتِ کعبہ کے لئے نذر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۲) وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے پاک رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی۔

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ. (صٰفّٰت۔ ۳۷ : ۱۰۵) ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صٰفّٰت۔ ۳۷ : ۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں۔

یہ تشریح ان بعض علماء کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں، ورنہ جمہور علماء اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے اور تعمیلِ حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی "اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا" اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیمی کی یہ سنتِ عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے کہ نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقراء کے لئے سامانِ دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذی حجہ ۱۳۵۵ھ (مطابق مارچ ۱۹۳۷ء "ض") مضمون "ذبح عظیم" اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ (مطابق مئی ۱۹۳۷ء) کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ "س"

چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لئے شریعتِ سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ ”خدا کے سامنے“ تھا توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔

لیت اسماعیل یعیش امامک — کاش اسماعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔

(توراۃ۔ تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

مکہ معظمہ

حضرت اسماعیلؑ کی بحث مسکن میں گذر چکا کہ وہ عرب تھا، مقامِ ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادیِ مکہ تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا (۱)، اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا　　پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا وہ "بکہ" میں تھا۔

(آل عمران۔۳ : ۹۶)

کتاب زبور۔۸۴۔۶ ص ۶۱ میں ہے ۔

"بکہ کی وادی میں گذرتے ہوئے ، اسے ایک کنواں بناتے ، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے اور یہ وہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود

(۱) مارگولیتھ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "اگر چہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد ﷺ کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی" مارگولیتھ نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں، لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے، جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔

ونصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارتِ مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے، لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکور کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربان گاہِ اسماعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے.................اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارکی ہو، ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں (۱) اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں:

۱۔ قربانی گاہ ہو۔

۲۔ حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

۳۔ وہ وادیِ بکہ کہلاتا ہو۔

۴۔ وہاں مقام مورہ بھی ہو۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مورۃ وہی مروۃ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ، ڈاکٹر ہسٹنگس نے ''ڈکشنری آف دی بائبل'' میں ''وادی بکا'' پر جو آرٹکل لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے:

۱۔ ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

۲۔ وادی اخور ہے، جو یشوعا باب ۷۔ آیات ۲۴۔ ۲۶ (ص ۳۴۸ 'ض') وغیرہ میں مذکور ہے۔

۳۔ وادی رفایون ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸۔ ۲۲ (ص ۴۹۰ 'ض') وغیرہ

[(۱) زبور۔ نشید ۸۴۔ ۱ تا ۵ ''ض''۔]

میں مذکور ہے۔

۴۔کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

۵۔ بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے (دیکھو رینان کی کتاب ''حیات عیسیٰ'' باب۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالاتِ کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، ع

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدّعا ایں جاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں، فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے ۔

جدید(۱) ''انسائیکلو پیڈیا'' میں محمد ﷺ کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مارگولیتھ کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے کہ:

''قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴۔۶) میں وادی بکہ کا لفظ ہے''۔

لیکن مارگولیتھ صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عبرانی داں عالم ہے، وہ لکھتا ہے:(۲)

''بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ داں ماکروبہ لکھتے ہیں''

لیکن مارگولیتھ کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لکھا ہے کہ:

''رومن مورخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیحؑ سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے''۔

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا طبع اخیر جلد ۱۰ صفحہ ۳۹۹، ارزاں ایڈیشن۔ (۲) ایضاً۔

اگر کعبہ حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیوں کہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے (ج ۸ ص ۱۲۳ ''ض'') کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس (۱) کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے۔

'' طول ۷۸ درجہ عرض ۳ء درجہ ''

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگولیتھ نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ '' مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی'' لیکن مارگولیتھ کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جابجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر: دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیمؑ نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ، بے رنگ ہر قسم کے نقش و نگار سے معرّا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا، جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغ دار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا، حضرت سارہؑ نے (جیسا کہ توراۃ میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیمؑ مکہ میں

(۱) بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہوگیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں۔

چلے آئے، حضرت اسماعیلؑ جوان ہو چکے تھے، اعلانِ حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی۔(۱)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمَاعِيْلُ (بقرہ۔۲ : ۱۲۷)	اور جب کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی ۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. (حج۔۲۲ : ۲۶ و ۲۷)	ہمارا گھر طواف کرنے والوں (نماز میں) قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں، پیدل بھی آئیں اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔

اس وقت اعلان واشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدودِ حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی، لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخِ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض وطول حسب ذیل تھا:

بلندی	زمین سے چھت تک ۹ گز۔
طول	حجرِ اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز۔
عرض	رکنِ شامی سے غربی تک ۲۲ گز ۔

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تا کہ ایسے مقام پر لگادوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخِ مکہ موسوم بہ اعلام باعلام بیت الحرام میں ہے:

فقال ابراهيم لاسماعيل عليهما الصلوة والسلام يا اسماعيل إئتنى بحجر اضعه حتى يكون علماً للناس يبتدؤن منه الطواف	پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لا دو تا کہ میں ایسی جگہ نصب کردوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی، نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے، جب

[(۱) محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی منہدم و بےنشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلندی، مزید توضیح کے لئے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھئے] "س"۔

قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انہوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی (۱)۔

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے، چنانچہ سب سے پہلے قبیلۂ جرہم آ کر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسماعیلؑ نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی، جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں، ان میں سے اکثر اہلِ عرب قیدار کی اولاد میں ہیں، حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسماعیلؑ سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آ گئی، لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا، حضرت اسماعیلؑ کا خاندان موجود تھا، لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی، قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرمِ کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا، یمن میں خاص قسم کی چادریں بنی جاتی ہیں، جن کو بردیمانی کہتے ہیں، یہ پردہ ان ہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا، قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا، جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا، علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا، لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے (۲)۔

خدا کا گھر سیم وزر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا، لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے

---

(۱) اعلام بہ حوالہ کتاب النسب از ابن بکار وابن الماوردی۔ (۲) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا، جو مصر میں بنا جاتا ہے ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہدِ خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردہ چڑھاتا تھا، حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح بن سلطان قلادون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے، جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمراں ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیئے (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) "بر حاشیہ خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام ص ۴۶ و ۴۷ مطبع خیریہ مصر ۱۳۰۵ھ" (ض) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخِ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے اخیر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

پتر چڑھائے ، عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں ، امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوادی جائے ، اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے، لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضرور بھی نہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی: خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفسِ قدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے، توراۃ میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی جو ابتدا ہوئی خواب سے ہوئی، یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، بہر حال حضرت ابراہیمؑ کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، انہوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اعتماد تھا، لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا:

يٰبُنَىَّ اِنِّىٓ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى (صٰفّٰت۔۳۷ : ۱۰۲)	بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری کیا رائے ہے۔

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِىٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صٰفّٰت۔۳۷ : ۱۰۲)	ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریے خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔

اب ایک طرف نود سالہ (۹۰) پیر ضعیف ہے جس کو دعاہائے سحر کے بعد خاندانِ نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی، فضائے آسمانی، عالمِ کائنات، یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتاً عالمِ قدس سے آواز آتی ہے۔

يٰاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (صٰفّٰت۔ ۳۷ : ۱۰۵)

ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
درزیرِ تیغ رفت وشہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

محمد رسول اللہ ﷺ

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لوے بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

صحیح بخاری (باب مبعث النبی ﷺ) میں یہیں تک ہے، لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیمؑ تک نام گنائے ہیں، یعنی عدنان بن ادد بن المقوم بن تارح بن یعرب بن یشجب بن نابت بن اسماعیلؑ بن ابراہیمؑ۔

سلسلۂ نسب: حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی، انہی کی اولاد میں عدنان ہیں اور آنحضرت ﷺ ان ہی کے خاندان سے ہیں، عرب کے نسب داں تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسماعیلؑ تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، عدنان سے لے کر حضرت اسماعیلؑ تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے، علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں:

ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ آباء او سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ	اور یہ عادتاً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یا ۱۰۔۲۰ پشتیں ہوں، کیوں کہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسماعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے، اس غلطی نے بعض عیسائی مورخین کو اس بات کا موقع

دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت ﷺ خاندان ابراہیمؑ سے ہیں۔(۱)

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس کے علاوہ اہلِ عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلۂ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے، تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے، جو اس فروگذاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ ''مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علماء دیکھے جو معد سے لے کر حضرت اسماعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے، اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا'' (۲) اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ ''شہر تدمر میں ایک یہودی تھا، جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ ''ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا وہ میرے پاس موجود ہے (۳) اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسماعیلؑ تک چالیس نام ہیں''۔ بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہے اور آنحضرت ﷺ عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش: آنحضرت ﷺ کا خاندان اگرچہ اباً عن جدٍ (۴) معزز اور

---

(۱) سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں: ''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسماعیلؑ کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسماعیلؑ کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، ان کی عینِ حیات میں پیدا ہوئی تھی اور اس طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسماعیلؑ اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے'' (لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں جو نہ صرف خاندانِ قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں، (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)۔ (۲) تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۱۸۔ (۳) تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۱۶۔۱۱۱۵۔ (۴) تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، لیکن مارگولیتھ نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاندان کو (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۵ پر)

ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرتِ منظوم میں لکھتے ہیں:

اما قریش فالاصح فہر جماعها والاكثرون النضر (۱)

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی حلیل خزاعی تھے، قصی نے حلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حُبّی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴) مبتذل ثابت کیا جائے، ان کے الفاظ یہ ہیں: ''یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے، اس کے بعد صاحبِ موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں: ا۔ قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا۔ ۲۔ پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت ﷺ کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے۔ ۳۔ رسول اللہ ﷺ کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپؐ نے اس لقب سے انکار کیا۔ ۴۔ فتحِ مکہ کے دن آپؐ نے فرمایا کہ: ''آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا'' قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں: وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں یعنی (مکہ و طائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، ان کو آنحضرت ﷺ کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا، دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہئے، کفار نے تو آنحضرت ﷺ کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟ بے شبہ آنحضرت ﷺ نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو، مولیٰ اور سید خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی خاندانی شرافت کا ابطال کیوں کر ہوتا ہے؟ اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی کم نسبی کیوں کر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین و متکبرینِ مکہ ہیں، مارگولیتھ صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کئے ہیں، جو مشہور جرمنی مستشرق ہے، ع

این خانہ ہمہ آفتاب است

(۱) زرقانی جلد اول ص ۹۰، ۱۲۹۱ھ۔

قصی: قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کئے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ (۱) اور رفادۃ جو خدامِ حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایامِ حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعرِ حرام بھی انہی کی ایجاد ہے، جس پر ایامِ حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول انہی کو ملا، (۲) چنانچہ علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں، کیوں کہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

قصی ابو کم من یسمی مجمعا ۔۔۔ به جمع الله القبائل من فهر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبدالدار، عبدمناف، عبدالعزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ۔ قصی نے مرتے وقت حرمِ محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیئے، (۳) اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے، لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبدمناف نے حاصل کی اور انہی کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاص خاندان ہے، عبدمناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحبِ صولت اور بااثر تھے، انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیئے گئے واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصبِ عظیم کے قابل نہیں، عبدالدار کے

---

(۱) سقایہ یعنی حاجیوں کو آبِ زمزم پلانا اور رفادۃ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ (۲) قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزء اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ ص ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہِ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لئے قریش کہلائے، بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے، جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے، چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے، اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی، عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے، لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے (ج ۱ ص ۷۰ و ۷۱ مطبع جمالیہ مصر ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء "ض") جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر نام رکھتے تھے، مثلاً اسد، نمر وغیرہ مورخینِ یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور ان ہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے، لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ (۳) طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۳۹۔

خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادۃ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم: ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصرِ روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ ''قریش جب اس کے ملک میں اسبابِ تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹکس نہ لیا جائے''۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا، چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے، اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایہ تخت تھا، تجارِ قریش انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے، ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ ''قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروانِ قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا(۱)۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا (۲) ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا، عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا، جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی اور دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندانِ بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے، ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی، اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہوگیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا، سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا،

(۱) امالی ابوعلی قالی (ذیل) ص ۲۰۴ مطلب خروج بنی عبدمناف الی الشام الخ مطبوعہ بولاق، مصر ۱۳۲۴ھ۔

(۲) طبری ج ۳ ص ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ ''س''۔

اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہاں آ کر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔

عبدالمطلب: عبدالمطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں اس لئے اربابِ سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق غلامِ مطلب مشہور ہو گئے (۱)۔

عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو گیا تھا، انہوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سر سے درست کرا دیا۔

عبداللہ: انہوں نے منّت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے، خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا، یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربانی کئے اور، عبداللہ بچ گئے، یہ واقدی کی روایت ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر روسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرتِ عام حاصل کی، یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے، خطاب آنحضرت ﷺ نے یا صحابہؓ نے دیا، لیکن یہ غلطی

(۱) دیکھو زرقانی جلد اول ص ۸۶۔

ہے، ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

آمنہ: عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلۂ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں (۱) وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا، اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی، حضرت حمزہؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں، ہالہ رشتہ سے آنحضرت ﷺ کی خالہ ہوئیں اور اس بنا پر حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے اور پھر گھر چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ برس سے کچھ زیادہ تھی (۲)۔

عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے، واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے، عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا، وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا، چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی، جس کا نام ام ایمنؓ تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ کو ترکہ میں ملیں، ام ایمنؓ کا اصلی نام برکہ تھا (۳)

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام (برحاشیہ زادالمعاد مطبع میمنہ مصر ج ۱ ص ۸۵) ''س''۔ (۲) زرقانی جلد اول صفحہ ۱۲۲ سطر ۷ (۳) طبقات ابن سعد (جزء اول قسم اول ص ۶۲) ''س''

ظہورِ قدسی

چمنستان دہر میں بار ہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت: لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضاو قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ جان نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گران ارز شاہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرّخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ ”آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیم شرؔ، آتش کدۂ کفر، آزر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین،

شمسۂ نُہ مسندِ ہفت اختران　　ختمِ رسل خاتم پیغمبران
احمدِ مرسل کہ خرد خاک اوست　　ہر دو جہان بستۂ فتراک اوست

امی و گویا بہ زبان فصیح　　از الف آدم و میم مسیح ٭
رسم ترنج است کہ در روزگار　　پیش دہد میوہ، پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوا، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلیٰ آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلِّمْ۔

تاریخِ ولادت: تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل روزِ دوشنبہ مطابق ۲۰/اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی (۱)۔

آپؐ کا نام "محمد" رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت: سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو آپؐ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا، (جو ابولہب کی لونڈی تھی) (۲)۔

حلیمہ سعدیہ: ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں

---

(۱) محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

☆ صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا (ابواب الکسوف باب الصلوۃ فی کسوف الشمس ج ۱ ص ۱۴۲) اور ۱۰ھ تھا، (اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا)

☆ ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۰ھ کا) گرہن، ۷/جنوری ۶۳۲ء کو ۸ بج کے ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔

☆ اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپؐ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے، جس میں از روئے قواعدِ ہیئت، ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲/اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

☆ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاوّل کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

☆ ربیع الاوّل مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخِ ولادت قطعاً ۲۰/اپریل ۵۷۱ء تھی۔

[(۲) بخاری کتاب النکاح باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب ج ۲ ص ۷۶۴ مطبع اصح المطابع، دیوبند۔] "س"۔

دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے (۱) اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنوامیہ نے دمشق میں پائے تخت قائم کیا اور شاہانہ شان وشوکت میں کسریٰ وقیصر کی ہم سری کی، تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے، ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جاسکا اور حرمِ شاہی میں پلا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانِ بنوامیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا (۲)۔

غرض دستورِ مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت ﷺ کی ولادت کے چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیؓ یہ بھی تھیں (۳)، اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

آنحضرت ﷺ کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی، لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جاسکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی اور آنحضرت ﷺ کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحب زادی تھیں جن کا نام شیما تھا، ان کو آنحضرت ﷺ سے بہت انس تھا، وہی آپ ﷺ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپ ﷺ کو مکہ میں لائیں اور آپؐ

(۱) امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ میں اس لئے فصیح ہوں کہ قبیلۂ بنی سعد میں پلا ہوں (الروض الانف ج اول ص ۱۰۹ ''س'') سر ولیم میور صاحب لائف آف محمدؐ (ص ۷ مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۱۲ء) میں لکھتے ہیں کہ ''محمد کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی''۔

[(۲) ابن اثیر ج ۵ ص ۶ طبع لیڈن ۱۸۷۰ء] ''س'' (۳) سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے الحرۃ لا تاکل بثدیھا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی (الروض الانف جلد اول ص ۱۰۹) لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہلِ شہر اور امراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا، لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ ﷺ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔(۱)

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیوں کہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے''۔(۲) بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپؐ میری ماں میری ماں، کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہؓ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے ''تاریخ'' میں ابن جوزی نے ''حدا'' میں منذری نے ''مختصر سننِ ابی داؤد'' میں، ابن حجر نے ''اصابہ'' میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''التحفة الجسيمة فی اثبات اسلام حليمة'' ہے(۳)۔

آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ حضرت حارث: حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ کا نام حارث ابن عبدالعزیٰ ہے، وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے (۴)

حارث آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھادوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارث مسلمان ہو گئے۔

رضاعی بھائی بہن: آنحضرت ﷺ کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں: عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ، جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر اور حضرت آمنہ کی وفات: آنحضرت ﷺ کی عمر جب چھ برس کی ہوئی

(۱) علامہ زرقانی نے اموی کا قول یہی بتایا ہے ''ض''۔(۲) طبقات ابن سعد جلد اول ص ۷۱۔(۳) زرقانی جلد ا ص ۱۶۶۔
(۴) اصابہ فی احوال الصحابہ جلد اص ۲۸۳ مطبع السعادۃ مصر۔

تو آپ ﷺ کی والدہ آپ ﷺ کو لے کر مدینہ گئیں، چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھی، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں امِ ایمنؓ بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت ﷺ کی دایہ تھیں، مورخین نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے، میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں، جو مدینہ میں مدفون تھے، بہر حال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء (۱) میں پہونچیں تو ان کا انتقال ہوگیا، اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمنؓ آنحضرت کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قیامِ مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپ قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنوعدی کے منازل پر گذرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا (۲)

عبدالمطلب کی کفالت: والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو اپنے دامنِ تربیت میں لیا، ہمیشہ آپ ﷺ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ (۳)۔

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت ﷺ بھی ساتھ تھے، اور فرطِ محبت سے روتے جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت ﷺ کی تربیت سپرد کی، ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے،

(۱) ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ (معجم البلدان ج ا ص ۹۲) (۲) طبقات ابن سعد قسم اول ذکر وفاتِ آمنہ ام رسول اللہ جلد ا صفحہ ۷۳۔ (۳) عبدالمطلب کا آنحضرت ﷺ کو عزیز رکھنا ایک مسلم واقعہ ہے، لیکن مارگولیتھ صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں کہ "یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی" اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہؓ نے نشہ کی حالت میں محمد ﷺ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا، (لائف آف محمدؐ از مارگولیتھ صفحہ ۴۵ تا ۴۹) حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال کیا ہے، مارگولیتھ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری کتاب المغازی باب شهود الملائكة بدراً ج ۲ ص ۵۷۱) میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گذرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ حضرت حمزہؓ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے، اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے؟

یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعتاً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنوامیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا، عبدالمطلب کی مسندِ ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصبِ ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابو طالب کی کفالت: عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت ﷺ کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو ابو طالب ہی کے آغوشِ تربیت میں دیا، ابو طالب آنحضرت ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروانہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپ ﷺ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپؐ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نام ور مورخ نے لکھا ہے کہ "ابوطالب چونکہ محمد ﷺ کو ذلیل رکھتے تھے اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے"، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے، خود قرآن مجید میں ہے: وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (نحل۔۱۶ : ۶) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانۂ رسالت میں آپؐ اس سادہ اور پر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ" جھڑ بیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپؐ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے، جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا(۱)

(۱) طبقات ابن سعد جلد اول ص ۸۰ بخاری نے کتاب الاجارہ باب رعی الغنم علی قراریط ج ۱ ص ۳۰۱ میں آنحضرت ﷺ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے، (عینی جلد ۴ صفحہ ۶۳۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

شام کا سفر: ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسبِ دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپؐ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپؐ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں" لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے، سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

بحیرا راہب کا قصہ: یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مارگولیتھ وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے انہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائدِ اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں (۱)۔

---

(۱) ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب (تیسرا باب ص ۱۰۷ اردو ترجمہ) میں لکھتے ہیں "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی.............. آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا.............. بعد میں آپ کے طرزِ عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا" سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، (لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارعِ اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحیدِ خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا، جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے)۔

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہئے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرقِ عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راویِ اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریکِ واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق یہ باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

۱۔ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ ''حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے'' (۱) حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

۲۔ اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ ''عبدالرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے'' (۲)۔

۳۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے'' علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ''میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں'' (۳)

۴۔ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابوبکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے حالانکہ

---

(۱) جامع ترمذی ابواب المناقب باب ما جاء فی بدء نبوۃ النبی ﷺ ج ۲ ص ۲۰۳ ''ض'' [(۲) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۳] ''ض'' (۳) نبراس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی ج ۱ ص ۲۲۷ اور میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۱۳ اور اصابہ (غالباً اصابہ کے بجائے تہذیب ہوگا ''ض'') (تذکرہ عبدالرحمٰن بن غزوان) (مستدرک حاکم مع تلخیص ج ۲ ص ۶۱۵) ''س''۔

اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔

۵۔ اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں، وہ شریکِ واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد (۱) میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے (وہ مرسل یا معضل ہے، یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریکِ واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے، اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)۔

۶۔ حافظ ابن حجر روات پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہتاً غلط ہے، اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادّعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام روات قابلِ سند ہیں، عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۲) میں لکھا ہے کہ ''وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے''۔ ممالیک کی ایک روایت ہے، جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں (۳)۔

حربِ فجار کی شرکت: عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آلِ ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ ﷺ بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوگیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالارِ اعظم حرب بن امیہ تھا، جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

[(۱) جزء اول قسم اول ص ۷۵] ''س'' (۲) (ج ۶ ص ۲۴۸) ''ض'' (۳) (جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرۃ النبی جلد سوم باب ''مشہور عام دلائل و معجزات (ص ۶۵۸ تا ۶۶۰ طبع جدید) ''ض'' کی روایتی حیثیت'' میں کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے) ''س''

چونکہ قریش اس جنگ میں برسرِ حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی، لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپؐ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وانما لم یقاتل رسول اللہ ﷺ مع اعمامه فی الفجار وقد کان بلغ سن القتال لانها کانت حرب فجار و کانوا ایضا کلهم کفارا ولم یاذن اللّٰه تعالی لمومن ان یقاتل الا لتکون کلمة اللّٰه هی العلیا ۔ (الروض الانف جلد اول ص ۱۲۰)

اور آپؐ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ آپؐ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی، نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لئے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول: لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھرانے برباد کر دیئے تھے اور قتل و سفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندانِ ہاشم، زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا (۱)۔

آنحضرت ﷺ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ "معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا (۲) اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں"۔

اس معاہدہ کو "حلف الفضول" اس لئے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ "فضیلت" کا مادّہ داخل تھا (۳) یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ

(۱) طبقات ج ۱ صفحہ ۸۲۔ (۲) (مستدرک ج ۲ ص ۲۲۰) "س" (۳) لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے، تـرد الفضول علی اهلها (الروض الانف جلد اول ص ۹۱) "ض"

رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی، تاہم بانیِ اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیرِ کعبہ: کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی اور دیواروں پر چھت نہ تھی، جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں، چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا اس کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوادیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے، حسن اتفاق یہ کہ جدّہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدّہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا، جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجرِ اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا، اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابوامیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی، دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمۂ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں وہ جمالِ جہاں تاب چہرۂ محمدیؐ تھا، لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہو، آپؐ نے فرمایا جو قبائل دعوے دار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ایک چادر بچھا کر حجرِ اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپؐ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا (۱) [یہ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری

(۱) (مسند طیالسی جلد اول ص ۱۸ و مستدرک حاکم جلد اول ص ۴۵۸) "س"

تکمیلی پتھر بھی ان ہی ہاتھوں سے نصب ہوگا۔(۱)]

اس طرح ایک سخت لڑائی آپؐ کے حسن تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقف کردی گئی، لیکن چونکہ سامانِ تعمیر کافی نہ تھا۔ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اوراس حصہ کے گرد چاردیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں اور جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے بعدِ نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سر سے عمارت بنائی جائے، لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوارِ کعبہ ڈھانے سے بدگمان ہوجائیں گے۔(۲)

شغلِ تجارت (۳): عرب اور قریش یعنی بنی اسماعیل، ظہوراسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے (۴) آنحضرت ﷺ کے جدِ اعلیٰ "ہاشم" نے قبائلِ عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کردیا تھا، آنحضرت ﷺ کے چچا ابوطالب بھی تاجر تھے، اس بناپر سنِ رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو جب فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابوطالب کے ساتھ آپؐ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور آپؐ کے حسنِ معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی، لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

[(۱) یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ "میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں"، یعنی مکملِ مذہب اور خاتم الرسل ہوں] "س" (دیکھئے صحیح بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبیین ج ۱ ص ۵۰۱ و سنن ترمذی ابواب الامثال باب ماجاء مثل النبی والانبیاء ج ۲ ص ۱۱۳ و ابواب المناقب باب ص ۲۰۲) "ض" (۲) یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں منفرداً اور زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۶ تا ۲۴۰ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری (کتاب المناسک باب فضل مکۃ و بنیانھا ج ۱ ص ۲۱۵) "ض" میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آنحضرت ﷺ بھی شریک تھے اور دوشِ مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے، یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔

(۳) اضافہ وزیادۃ (۴) توراۃ تکوین قصۂ یوسفؑ (باب ۳۷ آیت ۱۱ ص ۵۶ مدرسہ آکسفورڈ ۱۸۹۰) "ض"

تاجر کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمامِ وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصبِ نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امین ؐ اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبداللہ بن ابی الحمساءؓ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت ﷺ سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا، میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت ﷺ کو اسی جگہ منتظر پایا، لیکن اس خلافِ وعدہ سے آپ ﷺ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ ''تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں'' (۱)

کاروبارِ تجارت میں ہمیشہ آپ ؐ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے، نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپ ؐ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے، سائبؓ نام ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپ ؐ نے فرمایا ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں''۔ سائبؓ نے کہا، آپ ؐ پر میرے ماں باپ قربان، آپ ؐ میرے شریک تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا، **فکنت لاتداری ولا تماری** (۲) قیس بن سائبؓ مخزومی ایک اور صحابی بھی آپ ؐ کے شریکِ تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپ ؐ کے حسنِ معاملہ کی شہادت دیتے ہیں (۳)۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپ ؐ نے کئے تھے۔

تزویجِ خدیجہؓ: حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں، ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ملتا ہے اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ ؐ کی چچیری بہن تھیں، ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہلِ مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا (۴)۔

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۲۶ (مطبع محمدی کتاب الادب باب فی الوعد) (۲) ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۱۷۔ (۳) اصابہ (جلد ۵ ص ۲۵۳) ترجمہ حضرت قیسؓ بن سائب۔ (۴) (زرقانی ج ۱ ص ۲۳۱ پر اس کا ذکر ہے) ''ض''

جناب رسول اللہ ﷺ کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپؐ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ کے حسنِ معاملہ، راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک کہ زبانِ خلق نے آپؐ کو امین کا لقب دے دیا تھا، حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ ''آپؐ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپؐ کو اس کا مضاعف دوں گی''۔ آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا اور مالِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہِ راست تمام مراتب طے کئے، تاریخِ معین پر ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگِ فجار کے قبل انتقال کر چکے تھے (۱)

حضرت خدیجہؓ جس مکان میں رہتی تھیں وہ آج بھی (حسب بیان مورخ طبری) ان ہی کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا (۲)۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی اور پہلے دو شوہروں سے دو

---

(۱) الروض الانف ج اول ص ۱۲۲ و طبقات ابن سعد الجزء الاول القسم الاول ص ۸۵ ''ض'' (۲) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۱۳۰۔

صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے(۱)۔

آنحضرت ﷺ کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیمؑ کے حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے ہوئی، ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات: یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یک جا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدودِ سفر: اہلِ مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقاماتِ تجارت میں بھی آپؐ کا تشریف لے جانا ثابت ہے، عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے، ان میں سے حباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپ ﷺ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپؐ دو دفعہ تشریف لے گئے اور ہر دفعہ حضرت خدیجہؓ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا(۲)۔

نبوت کے بعد جس سال آپؐ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپؐ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپؐ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے"(۳) مورخینِ یورپ نے جو علومِ غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذباللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات

(۱) حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یک جا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہئے، حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری (ج ۳ ص ۱۱۳۰) "ض" نے کیا ہے، ابن حنبل (مسند ابن عباس) (ج ۱ ص ۳۱۲) "ض" میں بھی واقعات مذکور ہیں۔ (۲) نور النبراس فی شرح ابن سید الناس۔

(۳) مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۴) صفحہ ۲۰۶ "س"۔

سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ ''آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بوآتی ہے'' (۱) مورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈسی (بحرمیت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے (۲)۔

مراسمِ شرک سے اجتناب: یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصبِ پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسمِ شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپ نے کھانے سے انکار کیا (۳)۔

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہدِ نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ رکھا تھا (۴) اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے (۵) لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیوں کر استدلال ہوسکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت ﷺ ابھی تک منصبِ ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا اور اصل

---

(۱) مارگولیتھ صفحہ ۵۷۔ (۲) یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس ورائے پر ہوتی ہے، اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے، بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا، لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحرمیت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے، کیوں کہ اس کا موقع عرب وشام کے درمیان میں ہے، جہاں سے آپ کئی بار تجارت کے ساتھ گذرے ہوں گے) ''س''۔ (۳) صحیح بخاری کتاب المناقب باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل ص ۵۳۹ و ۵۴۰، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے، جو اس روایت میں صاف ہوگیا ہے، مسند امام ابن حنبل (جلد ا ص ۱۸۹) میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا، لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ (۴) عزیٰ ایک بت کا نام تھا۔ (۵) ص ۳۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہٖ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ صحیح تر سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسماعیل ہے جس کا پورا نام اسماعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن گروہِ کثیر کی رائے حسبِ ذیل ہے:(۱)

معاویہ بن صالح	اسماعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحیٰی بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نضر بن سلمہ مروزی	وہ کذّاب ہے۔
دارقطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنالیتا تھا۔

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کردی تھی اور جن لوگوں پر آپ ﷺ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے (۲) (مستدرک حاکم جلد سوم ص ۲۱۶ و ۲۱۷ ذکر زید بن حارثہ ذکر زید بن حارثہؓ ''س'')

---

(۱) (ماخوذ از تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۱۰ تا ۳۱۲) ''ض'' (۲) مسٹر مارگولیتھ نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ '' آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرلیا کرتے تھے، جس کا نام عزیٰ تھا'' مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام احمد ابن حنبل کی روایت (جلد ۴ ص ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی ﷺ وھو یقول لخدیجة ای خدیجة واللّٰه لا اعبد اللات والعزی واللّٰه لا اعبد ابدا قال فتقول خدیجة خل اللات خل العزی قال کانت صنمھم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون.

''مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہم سایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ بخدا میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) اس نے کہا کہ لات وعزیٰ وہ بت تھے، جس کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر کرلیا کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷ پر)

موحدین کی ملاقات: اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے فیضِ الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبیداللہ ابن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل، نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا (۱)، ان میں سے آنحضرت ﷺ نے زید سے ملاقات کی تھی، جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے، ورقہ عیسائی ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپ اُن سے بھی ملے ہوں گے، بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے آپ ﷺ کی دوستی تھی۔

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت ﷺ اس خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفّٰی ہیں، اس لئے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ طرز ان ہی سے لیا ہے، چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:

ایها الناس اسمعوا و وعوا، واذا وعیتم فانتفعوا ، انه من عاش مات، ومن مات فات وكل ما هو آت آت، مطرو نبات، وارزاق واقوات، وآباء وامّهات، واحیاء واموات ، وجميع واشتات، انّ في السمآء لخبرا وانّ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۶) ایک معمولی عربی داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت ﷺ کا سخت انکار کرنا مذکور ہے۔

مارگولیتھ صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیتھ کی کتاب صفحہ ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے (لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت) کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے۔

(۱) ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۳ تا ۱۴۸ (نسخہ محمد علی صبیح) میں قس بن ساعدۃ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، زید کا ذکر بخاری (کتاب المناقب باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل، جلد ۱ ص ۵۴۰) ''ض'' میں بھی ہے، قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

فی الارض لعبرا، لیل داج، وسماء ذات ابراج، وبحار ذات امواج، مالی اری الناس یذھبون فلایرجعون ارضوا بالمقام فاقاموا، ام ترکوا ھناک فناموا، این من بنی وشیّد وزخرف ونجد، وعدّالمال والولد، این من بغی وطغی.

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر ومطول بہ عبارات مختلفہ بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے روات عموماً ناقابل سند بلکہ کذّاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کر کے ان کے روات سے بحث کی ہے، اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کئے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ "کذّاب اور خبیث ہے"۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ "ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے"۔ ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرہ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ "ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا، یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے تھے"۔ ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابوبکرؓ نے قس ابن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے (۱) حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے (۲)۔

---

(۱) یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعہ مطبوعہ مصر صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۱۰۰ میں ہے۔ (۲) ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے، بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطباء کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القرأۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر ص ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابوبکرؓ، امیہ ابن ابی الصلت، ابوطالب کے سیکڑوں اشعار نقل کئے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۹ پر)

احبابِ خاص: نبوت سے پہلے جو لوگ آپؐ کے احبابِ خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں آپؐ کے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۸) دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں، مثلاً سریۂ عبیدۃ بن الحرث میں (ابن ہشام جلد اول صفحہ ۳۶۰ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکرؓ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واکثر اھل العلم والشعر ینکر ھذہ القصیدۃ لابی بکر .	اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔

یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی ہے، زیادہ اس وجہ سے کہ ان جلسوں یا شعروں میں آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ، اس میں یہ فقرے بھی ہیں:

نبیا قد حان حینه واظلکم اوانه فطوبی لمن امن به فھداہ وویل لمن خالفه وعصاہ (اللآلی المصنوعہ ص ۲۸)	ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آ گیا ہے سو اس کو مبارکی ہے جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا۔

ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (جلد اصفحہ ۱۶۱ تا ۱۷۱) سرتا پا موضوع ہے، اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

فاصبح فینا احمد فی ارومة ۔۔۔ تقصر عنه سورة المتطاول
فایدہ رب العباد بنصرہ ۔۔۔ واظھر دینا حقه غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتا پا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنف نے کہا ہے، اکثر کہنا صحیح ہے کیوں کہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں، مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستقاء (مگر صحیح بخاری وسنن ابن ماجہ باب الاستقاء اور مسند احمد ج اص ۷ وجلد ۲ ص ۳۹ میں ایک ہی شعر مذکور ہے اور صحیح مسلم میں وہ بھی نہیں ہے) ''ض''، خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے وبعض اھل العلم بالشعر ینکر اکثرھا ،یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں ''س'') اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں، مثلاً:

فقلت له اذھب بھارون فادعوا ۔۔۔ الی اللّٰہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا له اانت رفعت ھذہ ۔۔۔ بلا عمد ارفق اذا بک بانیا
وقولا له اانت سویت وسطھا ۔۔۔ منیرا اذا ماجنه الیل ھادیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مار گولیتھ نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں ''قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے'' (صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۶۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطباء اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرزِ ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فنِ ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

شریک صحبت رہے(۱)، حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احبابِ خاص میں تھے، حرم کا منصب رفادۃ انہی کے ہاتھ میں تھا، دار الندوہ کے بھی یہی مالک تھے، چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا، لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی، آنحضرت ﷺ سے عمر میں پانچ برس بڑے تھے(۲)۔

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے، ایک دفعہ کعبہ میں ذویزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلّہ تھا، انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت ﷺ کو نذر کریں، آپؐ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ نہیں قبول کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں، مجبور ہو کر انہوں نے قیمت لینی گوارا کی اور آنحضرت ﷺ نے اس کو لے لیا(۳)

حضرت ضماد بن ثعلبہؓ، جو ازد کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ بھی احباب خاص میں سے تھے، نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت ﷺ کو مجنوں کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے یہی قیاس کیا اور آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا محمدؐ! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد چند مؤثر جملے ادا کیے، ضماد مسلمان ہو گئے، اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۱ ص ۳۰۲) میں ہے۔

جو لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں سے ایک صاحب قیس ابن سائبؓ مخزومی تھے، مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسّر گذرے ہیں، ان ہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکاء کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا۔(۴)

---

(۱) اصابہ ذکر حضرت ابوبکرؓ (حضرت ابوبکرؓ کا نام عبداللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ کا حال لکھا ہے، جلد ۲ صفحہ ۳۴۱) ''س'' (۲) اصابہ ذکرِ حکیم بن حزام (جلد ۱ ص صفحہ ۳۴۹) ''س''۔ (۳) مسند امام ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۰۳۔ (۴) استیعاب (جلد ۲ صفحہ ۵۳۷) (س) و (اصابہ ج ۵ ص ۲۵۳)

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے، رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا تمغائے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، بایں ہمہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا، دیگر رسومِ جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہئے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایامِ حج میں قریش کے لئے عرفات جانا ضرور نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں، ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا (۱)، چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا (۲)۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق وشوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی (۳)۔

ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا، لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچا لیا کہ ''تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے''۔(۴)

---

(۱) ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول ص ۶۷۔ (۲) ابن ہشام ص ۶۹۔ [(۳) بزار ومستدرک بحوالہ نسیم الریاض ج اول ص ۶۰۹ وخصائص کبریٰ سیوطی ج اول ص ۸۸ حیدر آباد ۱۳۱۹ھ۔] ''س'' (۴) سر ولیم میور صاحب ''لائف آف محمد ﷺ'' میں لکھتے ہیں ''ہماری تمام تصنیفات محمد ﷺ کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہلِ مکہ میں کمیاب تھی متفق ہیں''۔

یہ فطرتِ سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعتِ کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہبِ کامل کی تشیید اور رہنمائی کونین کے منصبِ عظیم کے لئے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ کے قرب میں اور حق پرستوں (ورقہ، زید، عثمان بن حویرث) کے دل میں خیال آیا کہ جماد لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ سب مذہب حق کی تلاش کے لئے نکلے، لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا کر رہ گئے، ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے "اے خدا اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہئے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا(۱)"۔

آنحضرت ﷺ کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا، وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا، دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوبِ حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا، جس کو حرا کہتے ہیں، آپؐ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری (۲) میں ہے کہ غارِ حرا میں آپؐ تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی، عینی شرح بخاری (ج ۱ ص ۲۷) میں ہے:

قیل ما کان صفة تعبده اجیب بان ذلک کان بالتفکر و الاعتبار	یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔

یہ وہی عبادت تھی جو آپؐ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی، ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ....(انعام-۶ : ۷۷)	میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا..................
اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ. (انعام-۶ : ۸۰)	میں اپنا منھ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

ایک مغربی مورّخ نے آنحضرت ﷺ کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے۔

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۴ مطبعہ محمد علی صبیح مصر۔ (۲) باب کیف کان بدء الوحی ج ۱ ص ۲۔

''سفر و حضر میں ہر جگہ محمد ﷺ کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ میں کیا کام کروں؟ کیا کوہِ حرا کی چٹانیں، کوہِ طور کی سربہ فلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ گنبد گردان، گردشِ لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا''۔(۱)

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپؐ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپؐ خواب میں دیکھتے تھے، بعینہٖ وہی پیش آتا تھا (۲) ایک دن جب کہ آپؐ حسبِ معمول غارِ حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپؐ سے کہہ رہا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝ (علق۔۹۶ : ۱ تا ۵)	پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپ ﷺ گھر واپس تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے (۳)۔

آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے اور توریت و انجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ڈر پیدا ہوا حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ''آپ متردد نہ ہوں، خدا آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑے گا''۔ پھر وہ آپ ﷺ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔

---

(۱) کارلائل ہیروز تذکرہ رسول اللہ ﷺ۔ (۲) وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے، صحیح بخاری کے شروع میں ہے، اول مابدء بہ رسول اللہ ﷺ من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم (ج ۱ ص ۲) بخاری کتاب التعبیر باب اول ما بدئ بہ رسول اللہ ﷺ من الوحی ج ۲ ص ۱۰۳۳ میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔

(۳) صحیح بخاری باب بدء الوحی (ج ۱ ص ۳) و کتاب التعبیر باب اول ما بدئ الخ ج ۲ ص ۱۰۳۴، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، لیکن حضرت عائشہؓ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہؓ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے، کیوں کہ متروک راوی بھی صحابہؓ ہی ہوں گے۔

آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے شبہہ یہ الفاظ نکلے، ''مجھ کو ڈر ہے''، لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلالِ الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارِ گراں کی عظمت کا تخیل) تھا، آپؐ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری کتاب التعبیر (۱) میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعتاً حضرت جبریلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے ''اے محمد ﷺ تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو''۔ اس سے آپؐ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی، لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ ﷺ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبریلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ ''ایک پیغمبر کو نبوت میں کیوں کر شک ہو سکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے'' پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ ''نبوت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعتاً نہیں ہو سکتا، اس لئے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعتاً فرشتہ نظر آیا تو آپؐ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپؐ کو پورا یقین ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فلمّا سمع کلامہ ایقن بالحق واعترف بہ	جب آپؐ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپؐ کو حق کا یقین آ گیا اور آپؐ نے اس کا اعتراف کیا۔

محدثِ مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپؐ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں'' (۲)

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے سفرِ شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا'' (۳) جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ

(۱) (باب اول ما بدئ بہ رسول اللہ من الوحی ج۲ ص۱۰۳۴) ''ض'' (۲) فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۷ مطبوعہ مصر۔ (۳) ابواب المناقب باب ماجاء فی بدئ نبوۃ النبی ﷺ ج ۲ ص ۲۰۳ ''ض''

فرماتے ہیں کہ ''میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا (۱) جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلایش نکال کر پھینک دی (۲)'' تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیوں کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپ ﷺ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبریلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ ''میں خدا ہوں'' تو کیا ان کو کوئی شبہہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں، یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحینِ بخاری نے تصریح کر دی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیشِ نظر تھیں، اگر آپ ﷺ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغِ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتمِ انبیاء ﷺ کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پر خطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے، جو فیض یابِ صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ ﷺ کے صدقِ دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کی حرمِ محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپ ﷺ کی آغوشِ تربیت میں پلے تھے، زید تھے، جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے، حضرت ابوبکرؓ (۳) تھے جو برسوں سے فیض یابِ خدمت تھے، سب

(۱) کتاب الفضائل باب فضل النبیؐ و تسلیم الحجر علیه قبل النبوة ج ۲ ص ۲۷۸ ''ض''
(۲) (ترمذی ابواب التفسیر سورہ الم نشرح ج ۲ ص ۱۷۲) ''ض''۔ (۳) اصابہ فی احوال الصحابہ میں بزرگان موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہئے۔

سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند، ماہرِ انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے (۱) غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززین شہران سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، اربابِ روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران، حضرت طلحہؓ سب ان ہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے (۲) ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان سابقین اولین میں عمارؓ، خباب بن الارتؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، طلحہؓ، ارقمؓ، سعید بن زیدؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدہؓ، صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنخضرت ﷺ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے، ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیوں کہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی، (۳) ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپؐ کے چچا ابوطالب آنکلے، ان کو اس جدید طریقۂ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہوگئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون دین ہے، آپؐ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا ابوطالب نے کہا میں اس کو اختیار تو نہیں کرسکتا، لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہوسکے گا (۴)۔

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیوں کر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار

(۱) الجزء الثالث القسم الاول فی البدریین من المهاجرین ص ۱۲۲) "ض"۔ (۲) دیکھو ریاض النضرۃ المحب الطبری صفحہ ۱۵۷۔ (۳) (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۱ مطبوعہ مصر ذکر الاختلاف فی اول من اسلم) "س" (۴) (مسند احمد ج ۱ ص ۹۹ واصابہ ج ۷ ص ۱۱۲) "ض"۔

بتایا ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی چاہیے، یعنی یہ کہ اوائلِ اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے، ان میں چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے، جنہوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

۱۔ اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرتاً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے، مثلاً حضرت ابوبکرؓ جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے، عثمان بن مظعونؓ صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے، اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں، لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا، صہیبؓ، عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے، جو اسلام سے پہلے تارکِ شراب ہو کر وفات پا چکے تھے، حضرت ابوذرؓ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح ان کے ذہن میں آتا تھا خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت ﷺ کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں، واپس جا کر ابوذرؓ سے کہا کہ ”میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں، وہ مکارمِ اخلاق سکھاتا ہے اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے“۔ ابوذرؓ کو تسکین نہیں ہوئی، خود مکہ میں آئے، زبانِ مبارک سے آپؐ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کرلیا، وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ (مسلمان کے لئے زر و مال کا جمع کرنا جائز نہیں) چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں ان کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا (۱)۔

---

(۱) حضرت ابوذرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں (بخاری میں دو جگہ کتاب المناقب باب قصۃ زمزم ج ا ص ۴۹۹ و ۵۰۰ اور باب بنیان الکعبۃ باب اسلام ابی ذرؓ ج ا ص ۵۴۴ و ۵۴۵ اور صحیح مسلم باب من فضائل ابی ذرؓ ج ۲ ص ۳۴۷) ”ض“۔

۲۔ بعض صحابہؓ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانہ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں تھے، ان ہی میں زید بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، انہوں نے تو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحب زادے سعید موجود تھے، وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے، آنحضرت ﷺ سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آ گیا جس کی جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

۳۔ یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصبِ اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابوفکیہہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کو لے کر حرم جاتے تو روسائے قریش ہنس کر کہتے:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنْ بَيْنِنَا — یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔ (انعام۔۶ : ۵۳)

کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا، لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آ سکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو انقیادِ حق سے روک نہیں سکتا تھا، ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصبِ عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں ان پر دفعتاً پرتوافگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیاءؑ کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے ہیں، عیسائیت کے ارکانِ اولین ماہی گیر تھے، حضرت نوحؑ کے مقربینِ خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا:

وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ. (ھود۔۱۱ : ۲۷)

اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی ان ہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔

یہ سابقینِ اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، جس سے

ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خوں خواریاں، جور وظلم کے شدائد اور دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کرسکی اور آخر ان ہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت ﷺ نے نہایت راز داری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتابِ رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر۔۱۵ : ۹۴) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔

اور نیز حکم آیا :

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (شعراء۔۲۶ : ۲۱۴) اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

آنحضرت ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا، یا معشر قریش! لوگ جمع ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ''ہاں، کیوں کہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے''۔ آپؐ نے فرمایا ''تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا'' یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپؐ کا چچا بھی تھا، سخت برہم ہو کر چلے گئے (۱)۔

چند روز کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو، یہ درحقیقت تبلیغِ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندانِ عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابوطالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت ﷺ نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ ''میں وہ چیز لے کر آیا ہوں، جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے، اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا'' تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتاً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا ''گو مجھ کو آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا'' (۲)

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں، حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی، لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

---

(۱) (صحیح بخاری کتاب التفسیر الشعراء، باب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ج۲ص۷۰۲) (۲) [طبری نے تاریخ ج۳ صفحہ ۱۱۷۱ اور تفسیر ج۱۹ص ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے، پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بدمذہب، اس روایت میں اور بھی وجوہِ ضعف بلکہ وجوہِ وضع ہیں] ''س''

اب مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپؐ نے حرمِ کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا، کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعتاً ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور ہر طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت ﷺ کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہؓ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت ﷺ کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہوگئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا، جس سے زمین رنگین ہوئی (۱)

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب: مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی، قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایہ گانِ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے، اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے، جن کی تفصیل یہ ہے:

منصب (۲)	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون منصب حاصل تھا	آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر ممتاز تھے
حجابۃ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندانِ نوفل	حارث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندانِ ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندانِ اسد	یزید بن ربیعۃ الاسود
دیات ومغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندانِ تیم	حضرت ابوبکرؓ
عقاب	علم برداری	خاندانِ امیہ	ابوسفیان
قبۃ	خیمہ وخرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندانِ مخزوم	ولید بن مغیرہ

(۱) اصابہ فی احوال الصحابۃ ذکر حارث بن ابی ہالہؓ (ج ۱ ص ۳۰۶) "ض"، (۲) [یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد ۲ صفحہ ۳۱ میں ہے] "س"۔

سفارت ومنافرت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے، اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندانِ عدی	حضرت عمرؓ
ازلام وایسار	محکمۂ فال کا انتظام	خاندانِ جمح	صفوان بن امیہؓ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندانِ سہم	حارث بن قیس

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت واقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ)	حربِ فجار میں ان ہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔
ابولہب (آنحضرت ﷺ کا چچا)	
ابوجہل	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار،
ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ)	قریش کا رئیسِ اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاصؓ کا باپ)	نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحبِ اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہؓ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحبِ ریاست تھا

ان کے سوا، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدۃ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحبِ اثر تسلیم کئے جاتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خاندانِ ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے اور دونوں میں مدت سے رشک ورقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب: ناتربیت یافتہ اور تند خو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف ہو، ان کو سخت برہم کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور ان کی تشنگیِ انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی، آج ہندوستان اس قدر مہذب

ہوگیا ہے، لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور حکومتِ موجودہ اگر منتظم اور صاحبِ جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدّت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیلِ بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر وشر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا، یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجودِ معطل تھا۔

دوسرا سبب: اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعتاً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالم گیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدّت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیسِ اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حربِ فجار میں وہی سپہ سالارِ اعظم تھا، لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصبِ عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا، لیکن بنوامیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا، خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا جو رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا، جو نہایت دولت منداور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنانِ حکومت ان ہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ ابن خلف، عقبہ بن ابی معیط ان ہی لوگوں کے زیرِ اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصبِ اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف۔۴۳ : ۳۱)

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دوشہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیسِ اعظم پر اترنا تھا (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابومسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحبِ اولاد نہ ہو وہ عالمِ آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے۔

ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصافِ مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے، وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے، رسول اللہ ﷺ ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپؐ کا دامن پاک تھا اور اولادِ ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب: قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی ابرہۃ الاشرم (بادشاہِ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلہ میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (روم۔۳۰: ۲ تا ۴)

قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آجائیں گے، خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب: ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی، قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریفِ یک دگر تھے، بنو ہاشم و بنو امیہ، عبد المطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد خاندان میں کوئی صاحبِ اثر نہیں پیدا ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولت مند تھے، لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب بدچلن تھا، اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب

سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیسِ لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپؐ کے دوشِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اموی تھا، بنوامیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنومخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی، ابو جہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے، ایک دفعہ اخنس بن شریق ابو جہل کے پاس گیا اور کہا کہ "محمد ﷺ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے" ابو جہل نے کہا ہم اور بنوعبد مناف (یعنی آلِ ہاشم) ہمیشہ حریفِ مقابل رہے، انہوں نے مہمان داریاں کیں تو ہم نے بھی کیں، انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے، انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعوے دار ہیں، خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لاسکتے (۱)۔

پانچواں سبب: ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے ابولہب جو خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرمِ محترم کے خزانہ سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا (۲)، اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف تھا اور روسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے اعمالِ شنیعہ میں گرفتار تھے، آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دارو گیر کرتے تھے، جس سے ان کی عظمت واقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے:

---

(۱) ابن ہشام جلد اص ۱۹۳ مطبعہ محمد علی صبیح۔ مصر۔ (۲) حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا، یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (ص ۵۵ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۱۳۵) "ض"

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ ۭبِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيمٍ عُتُلٍّ ۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ (قلم۔ ۶۸: ۱۰ تا ۱۴)

اوراس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے، چغلیاں لگاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تندخو ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ جھوٹا ہے، نسب بناتا ہے، اس لئے کہ وہ مال دار اور لڑکوں والا ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا ۢ بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (علق۔ ۹۶: ۱۵، ۱۶)

وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی ہے اور خطاکار ہے۔

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن مدت کی عربی نخوت، دولت واقتدار کا فخر، ریاست کا زعم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوتی وہ باخبر نہ ہوتے، اس لئے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کیے جاتے تھے:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَّ جَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَّبَنِينَ شُهُودًا وَّمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيدَ كَلَّا اِنَّهُ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيدًا (مدثر۔ ۷۴: ۱۱ تا ۱۶)

ہم کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو، میں نے اس کو پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا، بیٹے دیئے، سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو اور دیں، ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے، جو قریش کا سرتاج تھا اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ واقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبود سیکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام ونشان مٹاتا تھا اور ان کی شان میں کہتا تھا۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء۔ ۲۱: ۹۸)

بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

قریش کے تحمل کے اسباب: ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلانِ دعوت کے ساتھ سخت خوں ریزیاں شروع ہو جاتیں، لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حربِ فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ

بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلا نہ لے لیا جائے، یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا، بلکہ سیکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا۔

رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے (۱)۔

غرض جب آنحضرت ﷺ نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابوطالب سے آکر شکایت کی، ابوطالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی، یعنی آنحضرت ﷺ ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش، یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے، ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آنحضرت ﷺ سے مختصر لفظوں میں کہا کہ "جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں" رسول اللہ ﷺ کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپؐ نے آب دیدہ ہو کر

---

(۱) (یہ آیت غالباً ان ہی لوگوں کی شان میں ہے، وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ (انعام ۶:۲۶) یعنی آنحضرت ﷺ کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ کے دعوائے نبوت سے دور رہتے تھے (اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق ج ۷، ص ۱۱۳)"س"

فرمایا" خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا یا اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا" آپ ﷺ کی پر اثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا، رسول اللہ ﷺ سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کرسکتا"۔(۱)

آنحضرت ﷺ بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے، قریش اگر چہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ نہ کرسکے، لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں، انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جاں بازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کرسکتا ہے، قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا "محمد کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کرسکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیرِ فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ"۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حٰم السجدۃ۔۴۱ : ۶)	اے محمد! کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔
قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (حٰم السجدۃ۔۴۱ : ۹)	کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، یہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ "محمد جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب

(۱) ابن ہشام ج ۱ص ۱۶۴ مطبعہ محمد علی صبیح مصر۔

ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا"۔ لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی (۱)۔

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام ۶ نبوی: آنحضرت ﷺ کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی، وہ آپؐ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن آپؐ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاقِ طبیعت سپہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحنِ حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس جا کر بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا، ایک دن ابوجہل نے رودر رو آپؐ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا، حضرت حمزہؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔

آنحضرت ﷺ کے جوشِ حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعتاً کیوں کر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے (۲)۔ دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں (۳) سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا، یعنی رسول اللہ ﷺ

---

(۱) ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۹ و ۱۸۰، امام بخاری نے بھی تاریخ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (۲) حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے، لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف روض الانف میں دیکھا ہے، (ج ۱ ص ۱۸۶) "ض"

(۳) حضرت عمرؓ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا تھا، اسی کو بعینہٖ یہاں نقل کر دیا ہے کہیں کہیں بعض بعض الفاظ یا جملے بدل دیئے ہیں (جامع نے حضرت عمرؓ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبیؐ جلد سوم بابِ استجابتِ دعا (ص ۵۳۷ تا ۵۴۱ طبع جدید) "ض" میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں) "س"

مبعوث ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہوگئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم ابن عبداللہؓ نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لاچکے تھے، ان کے دشمن بن گئے، لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی، جس نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ''دم لے لوں تو پھر ماروں گا'' لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اُترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کرسکے، آخر مجبور ہوکر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے، کارکنانِ قضا نے کہا: ع آمد آن یارے کہ ما می خواستیم۔

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہؓ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد ﷺ کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا ''پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لاچکے ہیں''۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہوگئیں اور قرآن کے اجزا چھپا لئے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں، انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں، تم دونوں مرتد ہوگئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہوگیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ ''عمر جو بن آئے کرو لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا'' ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے، مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہؓ نے قرآن کے اجزاء لاکر سامنے رکھ دیئے، اٹھا کر دیکھا تو یہ سورہ تھی:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (حدید۔ ۵۷ : ۱)

زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے :

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (حدید۔۵۷ : ۷) خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ:

اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا رسول اللّٰہ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہِ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزیں تھے، حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف تھے، صحابہؓ کو تردد ہوا لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا'' آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کردوں گا''۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا'' کیوں عمر کس ارادہ سے آیا ہے''؟ نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ'' ایمان لانے کے لئے'' آنحضرت ﷺ بے ساختہ اللّٰہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں (۱)

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کردیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداءؓ نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائضِ مذہبی علانیہ نہیں ادا کرسکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے ساتھ دفعتاً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جاکر نماز ادا کی۔

ابن ہشام نے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے :

فلما اسلم عمر قاتل قریشا حتیٰ صلی عند الکعبۃ وصلینا معہ (۲) جب عمر اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اتفاق سے

---

(۱) انساب الاشراف بلاذری وطبقات ابن سعد الجزء الثالث، القسم الاول فی البدریین من المہاجرین ص ۱۹۲ واسد الغابہ ج ۴ ص ۵۳ و ۵۴ ابن عساکر و کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۶۴ تا ۶۶ مطبوعہ لیڈن ۔ (۲) (ج ۱ ص ۲۱۰) ''ض''

عاص بن وائل آنکلا، اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے، لوگوں نے کہا عمر مرتد ہو گئے، عاص بن وائل نے کہا اچھا تو کیا ہوا، میں نے عمر کو پناہ دی (۱)۔

تعذیبِ مسلمین: رسوخِ عزم، قوتِ ارادہ، شدتِ عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن ان ہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفا کی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔

اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے جو دو ایک پشت سے مکہ میں آرہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے، جو کسی قسم کی عظمت واقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور وستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعتاً پاک کر دی جاتی، لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اتر نہیں سکتا تھا۔ مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ کر پیوند خاک کر دیئے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی، جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر پھر قریش کے مذہب میں آجاتے، یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آبا واجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابلِ احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت وافسوس کر کے رہ جاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آگیا ہے، عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

(۱) باب اسلام عمر بن الخطاب ج ۱ ص ۵۴۵۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے: بہر حال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کئے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتیلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے (۱)

یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بے کس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، ان کے نام یہ ہیں:

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقمؓ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پانوں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی (۲) [حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کی بقایا تھی، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمدؐ کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ "نہیں، جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں" (۳)۔]

حضرت بلالؓ یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ! ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "احـــد" کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے

---

(۱) یہ واقعات ابن سعد نے حضرت بلالؓ و صہیبؓ کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور جلد ثالث تذکرہ صحابہ بدرؓ (بلال کا تذکرہ ص ۱۶۵ تا ۱۷۰ اور صہیب کا ص ۱۶۱ تا ۱۶۴ میں ہے) "ض"۔ (۲) طبقات ابن سعد جلد سوم تذکرہ خبابؓ ص ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ (۳) صحیح بخاری (کتاب التفسیر تفسیر کھیٰعص (مریم) "ض" صفحہ ۶۹۲ (ج ۲) "س"

میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھرتے، لیکن اب بھی وہی رٹ تھی، احد، احد۔ (۱)

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد "یاسر" مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ تھا، شادی کر دی، عمار اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص (۲) اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہوگئیں۔ (۳)

حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔ (۴)

حضرت صہیبؓ، یہ رومی مشہور ہیں، لیکن در حقیقت رومی نہ تھے، ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے، یہ روم میں پلے، اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے ان کو خریدا اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔ (۵)

آنحضرت ﷺ نے جب دعوتِ اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسرؓ ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپؐ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے (۶) قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے، جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی

---

(۱) طبقات ابن سعد جلد سوم ص ۱۶۵ و ۱۶۶ (۲) "تین شخص" کتابت کی غلطی ہے، صحیح تیس شخص سے زیادہ ہے دیکھئے حاشیہ نمبر ۶ صفحہ ہذا و طبقات جلد سوم ص ۱۷۷ تذکرہ عمار) "ض" (۳) (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۵۰) "ض" (۴) (ایضا) "ض" (۵) طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۶۱) "ض" (۶) طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۷۷ تذکرہ عمار بن یاسر ص ۱۶۲) "ض" ابن الاثیر، ذکر تعذیب المستضعفین (ج ۲ ص ۴۹ تا ۵۲) "ض" ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمار اس وقت ایمان لائے، جب آنحضرت ﷺ ارقمؓ کے مکان میں چلے آئے تھے (ج ۲ ص ۵۰) "ض" اور جب کہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال ومتاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا (۱)۔

حضرت ابوفکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پانوں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک ''گبریلا'' راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا ''تیرا خدا یہی تو نہیں ہے''، انہوں نے کہا میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے'' اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہؓ، یہ بے چاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ (۲) اس بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ ''میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں''۔ وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ ''اگر تم اسلام نہ لاؤ گے، تو خدا اس کا انتقام لے گا''۔

حضرت زنیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے، ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں (۳)۔

حضرت ابوبکرؓ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی، حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرہؓ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا (۴)۔

یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے، جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ واعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۶۲ ''ض''۔ (۲) حضرت عمرؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ (۳) (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۵۱ و ۵۲ اور انساب الاشراف ج ۱ میں ان مستضعفین کا ذکر ہے) ''ض''۔ (۴) (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۵۰ تا ۵۲) ''ض''۔

نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا (۱) حضرت ابوذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں، جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا (۲) حضرت زبیر بن العوامؓ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے (۳)، حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی سعیدؓ بن زید جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا (۴) لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفا کیاں، ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں، ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ لکھا:

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے مسائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپؐ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے،۔۔۔۔۔۔ جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے، تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے ۔۔۔۔۔۔ برعکس اس کے محمد ﷺ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپؐ کو غالب کیا (۵)۔

ہجرت حبش ۵ نبوی: قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمتِ عالم ﷺ نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہلِ عرب حبش کے فرماں روا کو نجاشی کہتے تھے (۶) اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جاں نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا اس وقت تک حرم کعبہ میں کوئی شخص

(۱) [طبقات ترجمہ عثمان بن عفان ج ۳ ص ۳۸۔ (۲) بخاری ج ۱ ص ۵۴۴، ۵۴۵، باب اسلام ابی ذرؓ (۳) ریاض النضرہ للمحب الطبری (الباب السادس فی مناقب الزبیر الفصل الرابع ج ۲ ص ۲۶۳ آستانہ و مصر طبع اول) ''ض'' (۴) بخاری (کتاب الاکراہ باب من اختار الضرب والقتل والھوان علی الکفر ج ۲) ''ض'' ص ۱۰۲۷۔ اس وقت تک حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے] ''س'' (۵) ''اپالوجی گاڈفری ہیگنس'' ترجمہ اردو صفحہ ۶۶ و ۶۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء (۶) (نجاشی حبشی لفظ نجوش کی تعریب ہے جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں، نجاشی کا نام اصحمہ تھا، بخاری باب موت النجاشی ج ۱ ص ۵۴۷) ''س''

بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا، لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقامِ ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ الرحمٰن پڑھنا شروع کیا، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے، اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا، لیکن واپس گئے تو چہرہ (۱) پر زخم کے نشان لے کر گئے، (حضرت ابوبکرؓ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے)۔ (۲)

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں۔

غرض آنحضرت ﷺ کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ (بن عفان) — مع اپنی زوجہ محترمہ (حضرت) رقیہؓ کے جو رسول کریم ﷺ کی صاحب زادی تھیں۔

۲۔ (حضرت) ابو حذیفہؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) سہلہؓ (بنت سہیل) تھا۔ — ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔

۳۔ (حضرت) زبیر بن العوامؓ — رسول اللہ ﷺ کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔

۴۔ (حضرت) مصعبؓ بن عمیر — ہاشم کے پوتے تھے۔

۵۔ (حضرت) عبدالرحمٰن بن عوفؓ — مشہور صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، قبیلۂ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ننہالی رشتہ دار تھے۔

---

(۱) طبری (صفحہ ۱۱۸۸ جلد ۳) "س" (۲) [بخاری باب ہجرت مدینہ] "س" ج ۱ ص ۵۵۲ و ۵۵۳۔

۶۔ (حضرت) ابوسلمہؓ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ (بنت ابی امیہ) کے۔	یہ امِ سلمہؓ وہی ہیں جو ابوسلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں
۷۔ (حضرت) عثمانؓ بن مظعون جمحی	مشہور صحابی ہیں۔
۸۔ (حضرت) عامر بن ربیعہؓ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) لیلیٰ (بنت ابی خیثمہ تھا)	سابقینِ اولین میں ہیں، بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عثمانؓ نے سفرِ حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا (۱)
۹۔ (حضرت) ابوسبرۃ (۲) بن ابی رہمؓ	ان کی ماں برۃ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں،
(یا) (۳)	حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرتِ ثانیہ میں گئے تھے۔

(۱) (اصابہ ج ۴ ص ۸ مطبع شرفیہ، مصر ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء) ''ض'' (۲) (طبری ج ۳ ص ۱۱۸۳ و ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۶ مگر ابن ہشام نے سبرۃ لکھا ہے) ''ض''۔ (۳) حبشہ کے مہاجرینِ اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے: ابن اسحاق (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۹ و ۱۹۸) ''ض'' نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرتِ اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۰) ''ض''، (فتح الباری ج ۷ ص ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوسبرہؓ اور حضرت ابو حاتمؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا، لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی اضافہ کیا، (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری ج ۷ ص ۱۴۳) ابن سعد نے ان ہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے، جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے (ابن سعد اول ص ۱۳۶) ابن سیدالناس نے بھی بہ روایتِ زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے حضرت زبیرؓ کے بجائے حضرت سلیط بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول صفحہ ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں، وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیلؓ بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارث اور حضرت ہاشم بن عمروؓ کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابوسبرہؓ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیلؓ اور حضور ﷺ کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں) ''س''۔

(حضرت ابو)(۱) حاطب بن عمرو　　　　بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی (۲)

۱۰۔ (حضرت) سہیل بن بیضاء

۱۱۔ (حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ　　　　مشہور صحابی اور مجتہدینِ صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا، حسنِ اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھالیا، ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے، قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے، لیکن موقع نکل چکا تھا (۳)۔

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت ان ہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا، لیکن فہرستِ مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، حضرت عثمانؓ بنوامیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار خاندان تھا، متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ابوسبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں پر محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا، یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ، ان لوگوں کا نام مہاجرینِ حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لئے یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا، یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم ز جورِ تو آسودہ است و می نالم　　　　کہ غیر پے نہ برد لذتِ خدنگِ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتحِ مصر)

---

(۱) (ابو حاطب حسب روایت ابن ہشام ج ا ص ۱۹۸ لیکن طبری (جلد ۳ ص ۱۱۸۳) و ابن سعد (جلد ا ص ۱۳۷) نے حاطب ہی لکھا ہے) ''ض'' [(۲) اصابہ ج ۷ ص ۴۰] ''ض'' (۳) یہ تمام تفصیل طبری (جلد ۳ ص ۱۱۸۲ و ۱۱۸۳) ''ض'' میں ہے (مہاجرینِ حبشہ کے نام طبقات ابن سعد جزء اول قسم اول ص ۱۳۶ و ۱۳۷ میں بھی ہیں) ''ض''۔

اس کام کے لئے منتخب ہوئے (۱) نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے (۲) اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں آپ بھی ہماری تائید فرمائیں، دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیئے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا ''تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے، جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے''۔

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا، انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

ایھا الملک! ''ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہم سایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہم سایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس آ جائیں''۔

نجاشی نے کہا ''جو کلامِ الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو'' حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا ''خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں'' یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا ''تم واپس جاؤ، میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا''۔

---

(۱) (مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲) ''س'' (وابن سعد ج ۱ ص ۲۰۴ آگے کی تفصیل بھی ابن سعد میں موجود ہے) ''ض'' (۲) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا (ج ۱ ص ۲۰۵) ''ض'' اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ شام وغیرہ کو جو مالِ تجارت لے جاتے تھے وہ بھی چمڑا ہوتا تھا، (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا، مسند اہل البیت (بلکہ مسند احمد میں خود حضرت عمرو بن عاص کے یہ الفاظ منقول ہیں'' وکان احب ما یھدی الیہ من ارضنا الادم فجمعنا لہ ادما کثیرا ج ۴ ص ۱۹۸) ''ض''

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے، ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفرؓ نے کہا، کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہئے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا ''ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ ''عیسیٰؑ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے''۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا ''واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں''۔ (۱) بطریق جو دربار میں موجود تھے، نہایت برہم ہوئے نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے (۲)۔

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اسکے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں، حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزم گاہ میں پہنچے، اُدھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے

(۱) (مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر) ''س'' (۲) مارگولیتھ صاحب نے ہجرتِ حبش کی بھی بڑی نازک اور دوراز نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ ''جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہِ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تا کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا، لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر ارادے سے باز رہے''۔ یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اوّلاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے، (کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے، جیسا کہ ابوسفیان اور قیصرِ روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے، بخاری باب بدء الوحی ج ۱ ص ۴) ''س''۔

لئے خدا سے دعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوش خبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی (۱)۔

حبش میں کم وبیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے (۲) چند روز آرام سے گذرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے، یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے، اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری (۳) اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے یہ آیت پڑھی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی (نجم ۔۵۳ :۲۰) تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے :

تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی یعنی (یہ بت) معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپؐ کی متابعت کی، (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب (قَوْلُہٗ فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا) میں مذکور ہے (۴) مگر باقی) قصہ بے ہودہ اور نا قابلِ ذکر ہے، اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی (۵) نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے

---

(۱) یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۰۴ تا ۲۰۸) ''ض'' نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا ہے، امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلۂ روایت یہ ہے، محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام مخزومی، ام سلمہؓ، یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ، جو رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں، وہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے عقد میں نہیں آئی تھیں۔ بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بہ تفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۸ و ۲۹ مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۳ء) ''ض''۔ (۲) (ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۳) ''ض''۔ (۳) (ج ۳ ص ۱۱۹۲ و ۱۱۹۴) ''ض'' (۴) (کتاب التفسیر سورہ نجم ''س'') ج ۲ ص ۷۲۱ (۵) دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ (ج ۱ ص ۳۲۶ و بعد) ''ض'' وشفائے قاضی عیاض (مع شرح شہاب خفاجی ج ۴ ص ۹۵ و بعد) ''ض'' وعینی شرح بخاری تفسیر سورہ نجم (ج ۹ ص ۱۸۱) ''ض'' ونور النبراس، علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں، لا یصح فیه شیئ لا من جهة النقل ولا من جهة العقل شرح مسلم (باب سجود التلاوۃ ج ۵ ص ۷۵) اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحة له نقلا و عقلا (ج ۹ ص ۱۸۱) ''ض''

محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر (۱) شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمالِ فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: (۲)

وقد ذکرنا ان ثلاثۃ اسانید منھا علی شرط الصحیح وھی مراسیل یحتج بمثلھا من یحتج بالمراسیل	ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار مکہ کی عادت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیتِ ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم السجدۃ۔۴۱ : ۲۶)	اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کر دو شاید تم غالب آؤ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے (۳):

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری فانھن الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجیٰ	لات اور عزیٰ اور تیسرے بت مناۃ کی قسم، یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب سورۂ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپ ﷺ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ہی نے وہ الفاظ ادا کئے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا، تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپؐ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا۔

یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے، مواہب (۴) میں ہے۔

---

(۱) دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ (ج ۱ ص ۳۲۶ و بعد) ''ض''۔ (۲) زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۳۳۰ (۳) معجم البلدان لفظ عزیٰ (ج ۶ ص ۱۶۶ طبع اول ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء مصر) ''ض''۔ (۴) الزرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۳۳۱ و ۳۳۲) ''ض''۔

قیل انه لما وصل الی قوله و مناة الثالثة الاخری خشی المشرکون ان یاتی بعدها بشیء یذم آلهتهم به فبادروا الی ذلک الکلام فخلطوه فی تلاوة النبی ﷺ علی عادتهم فی قولهم لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه ..... او المراد بالشیطان شیطان الانس.

بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ اس آیت پر پہنچے وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت ﷺ کی تلاوت میں یہ فقرے خلط کر کے پڑھ دیئے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑ بڑ مچادو، یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔

جو لوگ حبش سے واپس آگئے تھے اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا اور اس قدر اذیت دی کہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے، مکہ سے نکل گئے اور حبش میں اقامت اختیار کی، جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں ان کو بلا لیا(۱)

کفار کی ایذا و تعدّی اب کمزوروں اور بے کسوں پر محدود نہ تھی، حضرت ابوبکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقت ور قبیلہ تھا، ان کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آگئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے(۲) وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا کہاں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں''۔ ابن الدغنہ نے کہا ''یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں'' تو حضرت ابوبکرؓ اس کے ساتھ واپس آئے، ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے، قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکرؓ نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی، لیکن آخر انہوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ

(۱) یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد ج اول قسم اول ص ۱۳۸ و ۱۳۹ میں ہے، بعض مورخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (۲) زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۳۳۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔

بہ آواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا، حضرت ابو بکرؓ نے کہا ''مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہارے جوار سے استعفاد یتا ہوں'' (۱)۔

محرم ۷ نبوی شعبِ ابوطالب میں محصور ہونا: قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفراء بے نیلِ مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ ''کوئی شخص نہ خاندانِ بنی ہاشم سے قرابت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں''۔ (۲) یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور درِ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم کے ساتھ شعب ابوطالب (۳) میں پناہ گزیں ہوئے تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گذرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے، یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے کہ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ (۴)

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش

---

(۱) یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرتِ مدینہ میں ہے (ج ۱ ص ۵۵۲ و ۵۵۳) ''ض'' (۲) اس معاہدہ کا ذکر طبری (ج ۳ ص ۱۱۸۹) ''ض'' نے اور ابن سعد (ج ۱ ص ۱۳۹ و ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۵) ''ض'' وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ (۳) یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا جو خاندانِ بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ (۴) روض الانف ج ۱ ص ۲۳۲۔

سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا (۱) ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آ گیا وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ''ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے'' (۲)

متصل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آلِ ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود ان ہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندانِ بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا ''کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو''؟ زہیر نے کہا کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں'' ہشام نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے، زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''اے اہلِ مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا'' ابوجہل برابر سے بولا ''ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا'' زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا تھا، اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے (۳) بقول ابن سعد یہ ۱۰ انبوی کا واقعہ ہے، اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی جس کی تفصیل تیسرے حصہ میں آئے گی، اسی زمانہ میں نماز پنج گانہ فرض ہوئی۔

۱۰ انبوی، حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات: آنحضرت ﷺ اب شعب ابوطالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ

(۱) (ج اص ۱۴۰) ۔ (۲) (ابن ہشام ج اص ۲۱۶) ''ض'' ۔ (۳) یہ تفصیل ابن ہشام (ج اص ۲۲۸ و ۲۲۹) ''ض'' و طبری (ج ۳ ص ۱۱۹۶ تا ۱۱۹۸) ''ض'' وغیرہ میں مذکور ہے، اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے (ج اص ۱۴۱) ''ض''

کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب کی وفات کے وقت آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے، آپؐ نے فرمایا ”مرتے مرتے لا الہ الا اللہ کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں“ ابو جہل اور ابن ابی امیہ نے کہا ”ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے“ بالآخر ابو طالب نے کہا ”میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں“۔ پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا ”میں وہ کلمہ کہہ دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا“ آپؐ نے فرمایا ”میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا، جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے“۔(۱)

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے، حضرت عباسؓ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ”تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا، ابو طالب وہی کہہ رہے ہیں“ (۲)۔

اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے، لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے، اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابلِ حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیبؓ ہیں جو فتحِ مکہ میں اسلام لائے اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے، اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ”روایت مرسل ہے“ (۳) ابن اسحاق کے سلسلۂ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے، اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں (۴)۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اذا قال المشرک عندالموت لا الہ الا اللّٰہ ج ا ص ۱۸۱ و باب قصۃ ابی طالب ج ا ص ۵۴۸ اور مسلم کتاب الایمان باب اول الایمان قول لا الہ الا اللّٰہ ج ا ص ۳۰ و ۳۱) ”ض“ ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں۔ (۲) ابن ہشام مطبوعہ مصر ص ۱۴۶۔ (۳) عینی کتاب الجنائز (ج ۴ ص ۲۰۰) ”س“ (۴) مصنف کے اس نظریے سے مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخر راوی حضرت مسیبؓ ہیں جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی، اسی لئے مراسیلِ صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے، اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷ پر)

ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کے لئے جو جاں نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کرسکتا ہے، وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپؐ پر نثار کرتے تھے، آپؐ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنالیا، آپؐ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی۔

ابو طالب، آنحضرت ﷺ سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے، رسول اللہ ﷺ کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کردے"۔ آپؐ نے دعا کی اور وہ اچھے ہوگئے، آنحضرت ﷺ سے کہا خدا تیرا کہنا مانتا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے" (۱)

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات کی، بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا، اب آپؐ کے مددگار اور غم گسار دونوں اٹھ گئے، صحابہ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت ﷺ اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے۔ (۲)

حضرت خدیجہؓ نے رمضان ۱۰ نبوی میں وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت ﷺ خود ان کی قبر میں اترے، اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔ (۳)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۶) علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیبؓ والی روایت سے اوپر صحیح بخاری (باب قصۃ ابی طالب ج ۱ ص ۵۴۸) "ض" میں موجود ہے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہؐ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پر خاش رہتے تھے، فرمایا وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں، مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصۂ ابی طالب (ج ۱ ص ۵۴۸) "ض" میں اسی موقع پر موجود ہے "س"۔)

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابی طالب (ج ۷ ص ۱۱۳) "ض"۔ (۲) زرقانی بر مواہب لدنیہ ج ۱ ص ۲۹۴۔ (۳) یہ تفصیل ابن سعد میں ہے، (ج ۸ فی النساء ص ۱۱) "ض"۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی و بے باکی سے آنحضرت ﷺ کو ستاتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آکر فرق مبارک پر خاک ڈال دی، اسی حالت میں آپ ﷺ گھر میں تشریف لائے، آپ ﷺ کی صاحب زادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں، آپ ﷺ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے روتی جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا "جانِ پدر! رو ؤنہیں، خدا تیرے باپ کو بچالے گا"۔ (۱)

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی، اس لئے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوتِ اسلام فرمائیں، طائف میں بڑے بڑے امرا اور ارباب اثر رہتے تھے، ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا، یہ تین بھائی تھے، عبد یالیل، مسعود، حبیب، آنحضرت ﷺ ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی، ان تینوں نے جو جواب دیئے وہ نہایت عبرت انگیز تھے، ایک نے کہا "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور نہیں ملتا تھا"۔ تیسرے نے کہا "میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں"۔

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دورویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا، جب آپؐ اُدھر سے گذرے تو آپؐ کے پانوں پر پتھر مارنے شروع کیے، یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں، جب آپؐ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے (۲)، آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی، یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا، اس نے آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔

---

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۱۹۹) "ض" اور ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۵۲) "ض" ذکر وفات حضرت خدیجہؓ۔ (۲) یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالۂ موسیٰ بن عقبہ (ج ۱ ص ۳۴۵) "ض" اور طبری (ج ۳ ص ۱۱۹۹ تا ۱۲۰۱) "ض" و ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۵۳ و ۲۵۴) "ض" میں ہے۔

اس سفر میں حضرت زید بن حارثہؓ بھی ساتھ تھے۔(۱)

رسول اللہ ﷺ نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالبِ حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے، مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ''ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ'' رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا، تو پکارا کہ ''میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے''۔ آنحضرت ﷺ حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپؐ کو تلواروں کے سائے میں لائے (۲)۔

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسانؓ جو دربارِ رسالت کے شاعر تھے، انہوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے (۳) اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آج کل کے مسلمان حضرت حسانؓ اور زرقانی سے زیادہ شیفتۂ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسانؓ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔

قبائل کا دورہ: آنحضرت ﷺ کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آ کر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپؐ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغِ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپؐ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

---

(۱) (طبقات ج ۱ ص ۱۴۲) ''ض'' کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے، مارگولیتھ نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کے اس سفر کو سوئے تدبیر میں داخل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے، جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت ﷺ کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی'' لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا زورِ اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں گئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا۔

ع　والفضل ما شهدت به الاعداء

(۲) ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے، جو ابن اسحاق کی روایت ہے، تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔ (۳) زرقانی جلد اول ص ۵۱۶۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہلِ عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا اور مجنۃ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائلِ عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نضر، کندۃ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ، مشہور قبائل ہیں (۱) ان سب قبائل کے پاس آپؐ تشریف لے گئے، لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا اور جب آپؐ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے"۔ (۲)

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا (۳) مسیلمہ کذّاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلۂ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپؐ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا "تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں" مفروق نے آنحضرت ﷺ کی طرف رخ کر کے کہا کہ "برادرِ قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو"؟ آپؐ نے فرمایا "خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں" اور یہ آیتیں پڑھیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ. (انعام۔۶: ۱۵۲)

کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کا حقِ خدمت بجالاؤ اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے، فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ، وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ناحق ہلاک نہ کرو، یہ تم کو خدا نے وصیت کی تاکہ تم سمجھ سکو۔

اس قبیلہ کے رؤسا، مفروق، مثنی اور ہانی بن قبیصہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی، لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعتاً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے، اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپؐ نے ان کی راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا"۔ (۴)

(۱) ابن سعد (ج ۱ ص ۱۴۵) "ض" نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔ (۲) (ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۵) "ض" و مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵ حیدرآباد) "س"۔ (۳) ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۵۶) "ض"۔ (۴) روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت (ج ۱ ص ۲۶۴ و ۲۶۵) "ض"۔

قبیلۂ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپ ﷺ کی تقریر سن کر کہا "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آ جائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں" پھر آپؐ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ جاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہ خدا کے ہاتھ ہے" اس نے کہا "ہم اپنا سینہ عرب کا آماج گاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں"۔ (۱)

قریش کی آپ ﷺ کو ایذا رسانی: اسبابِ مذکورہ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ ﷺ کو اس قدر ستائیں کہ آپؐ مجبور ہو کر تبلیغِ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سوء اتفاق یہ کہ جو کفار آپؐ کے ہم سایہ تھے، یعنی ابو جہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سر برآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپؐ کے دشمن تھے (۲) یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپؐ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردنِ مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں (آپ ﷺ کی روحانی قوتِ اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنوں کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے (۳) نمازِ جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے)۔ (۴)

ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابو جہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد ﷺ سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا"۔ عقبہ نے کہا "یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں" چنانچہ اوجھ لا کر آپؐ کی گردن پر ڈال دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر

---

(۱) [طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵] "س" و (ابن ہشام ج ۱ ص ۲۵۶) "ض"۔ (۲) [ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۳۴۔ (۳) مسند امام ابن حنبل جلد ۱ ص ۳۰۲۔ (۴) صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل باب لا تجہر بصلاتک الخ ج ۲ ص ۶۸۶۔]

حضرت فاطمہؓ کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں"۔(۱)

آنحضرت ﷺ جب کہیں کسی مجمعِ عام میں دعوت اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، برابر سے کہتا جاتا کہ "یہ جھوٹ کہتا ہے" ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لاچکا تھا، آنحضرت ﷺ بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ "لا الہ الا اللہ کہو" ابوجہل آپؐ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ "اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی پرستش چھوڑ دو" (۲) طائف میں کفار نے آپؐ کو جو تکلیفیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گذر چکا۔

ایک دفعہ آپؐ حرمِ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپؐ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور آپؐ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ "اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے" (۳)۔

جو لوگ آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے، ان کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں:

"ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبدیغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن المغیرہ، امیہ ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہہ بن المغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن صیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء"۔(۴)

یہ سب کے سب آنحضرت ﷺ کے ہم سایہ اور ان میں سے اکثر صاحبِ جاہ واقتدار تھے۔

یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت درد انگیز اور حسرت خیز تھا، لیکن تعجب انگیز نہ تھا، دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الوضوء باب اذا القی علی ظہر المصلی قذر او جیفۃ الخ ج۱ ص۳۷ وکتاب الجہاد (باب طرح جیف المشرکین فی البئر الخ ج۱ ص۴۵۲ وصحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب مالقی النبیؐ من اذی المشرکین ج۲ ص۹۱ وزرقانی جلد اول صفحہ ۲۹۴) (۲) مسند امام ابن حنبل جلد۴ صفحہ ۶۳ (۳) صحیح بخاری باب مالقی النبی ﷺ واصحابہ من المشرکین بمکۃ ج۱ ص۵۴۳ (۴) (طبقات ابن سعد ج۱ ص۱۳۳ و۱۳۴) "ض"

سیکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار ورسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرورِ عالم ﷺ نے کیا کیا؟۔

مسلمانوں کا گھبرانا اور آپؐ کا تسلی دینا: سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایتِ نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ آپؐ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ ”تم سے پہلے وہ لوگ گذرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا“۔(۱)

کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی؟۔

(۱) صحیح بخاری بـاب مـالقی النبی واصحابه من المشرکین بمکة ج۱ ص۵۴۳ ،ذکر ایام جاهلیة و کتاب الاکراه باب من اختار الضرب الخ ج۲ ص۱۰۲۷۔

مدینہ منورہ اور انصارؓ

آفتاب کی روشنی دور پہنچ کر تیز ہوتی ہے، شمیمِ گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے، آفتابِ اسلام طلوع مکہ میں ہوا، لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں۔

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے، رسول اللہ ﷺ نے جب یہاں آ کر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی یعنی پیغمبر کا شہر پڑ گیا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا۔

یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، بہت قدیم زمانہ میں یہودی یہاں آ کر آباد ہوئے، ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف ان کے قبضہ میں آ گئے، انہوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے اور ان میں سکونت رکھتے تھے، (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی)۔

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا، جس کو "سیلِ عرم" کہتے ہیں، یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے، اوس اور خزرج، تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں (۱) یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے، آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے، چونکہ آل واولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے، اس لئے دور دور تک بستیاں بسا لی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک ان سے الگ رہے، لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر ان کے حلیف بن گئے (۲) ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی، لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور

(۱) انصار کے نسب اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفا جلد اول صفحہ ۱۱۶ تا ۱۵۲ میں مذکور ہے۔ (۲) جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت و شرکت کا (بہ حلف) معاہدہ کرتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستانِ عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گذری، مالک کو غیرت آئی، اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی، اس نے کہا "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے"۔ دوسرے دن حسبِ دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا، یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابوجبلہ حکمراں تھا، اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوجِ گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیئے، پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا اور انصار نے نئے سرے سے قوت حاصل کی (۱)۔

انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے، اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور سخت خوں ریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں، اس زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نام ور لڑ لڑ کر مر گئے، انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے، تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا، اس لئے نبوت اور کتبِ آسمانی سے گوش آشنا تھے، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے، لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے) (۲)، ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے، اس

---

(۱) وفاء الوفا (ج ۱ ص ۱۲۶) "ض" یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفا میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں، (اس کا ذکر معجم البلدان ج ۷ ص ۴۲۸ و ۴۲۹ میں بھی ہے) "ض"۔ (۲) (بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۷ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ و نحوہ فی الحق وغیرہ) "س"۔

لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا (۱) یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا، اس کو امثالِ لقمان کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا، جس کو وہ کتابِ آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے، اس نے امثالِ لقمان پڑھ کر سنایا، آپ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے"، یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی (۲) اگرچہ وہ مدینہ واپس آ کر جنگِ بعاث میں مارا گیا، لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہل عرب "کامل" کہتے تھے اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا (۳)، سوید کے میلانِ اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے، رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ "خدا کی قسم تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے"، لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالحیس نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ "ہم اس کام کے لئے نہیں آئے" اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آ گیا اور ایاس آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے، لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی (۴)۔

---

(۱) (کتب تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کی تفسیر دیکھو ابن جریر ج ۳ ص ۹ مطبع میمنہ، مصر و ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۰ و ۳۱۱ مطبع مصطفےٰ محمد، مصر ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء۔ (۲) (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۷) "س"۔ (۳) سوید کا ذکر ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۵۷) "ض" میں ہے، لیکن روض الانف (ج ۱ ص ۲۶۵ و ۲۶۶) "ض" میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے، لیکن نسب میں اختلاف ہے اور امثالِ لقمان کا ذکر نہیں ہے، طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے، دیکھو ج ۳ ص ۱۲۰۷۔ (۴) طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۸) "س"۔

انصار کے اسلام کی ابتدا ۱۰ نبوی: جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغِ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب ۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس، جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپ ﷺ کو نظر آئے، آپؐ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا ''خزرج'' آپؐ نے دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا ''دیکھو! یہود ہم سے اوّلیت میں بازی نہ لے جائیں'' یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، یہ چھ شخص تھے (۱) جن کے نام حسب ذیل ہیں (۲)۔

---

(۱) مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے بعض مصنفینِ سیرت نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعتِ عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے، یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے، جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴ تفسیر ابن کثیر علی حاشیۂ فتح البیان ج ۹ ص ۴۴۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔

اسی اختلافِ روایت کے سبب سے بعض مصنفینِ سیرت بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں ۱۲ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں۔

حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعۂ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلامِ انصار ہونا چاہئے اور دوسرے سال جب کہ گیارہ بارہ آدمی حاضرِ خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۸) حضرت عبادہؓ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے، **کنا احد عشر فی العقبة الاولی من العام المقبل**، (مستدرک ج ۲ ص ۶۲۴ حیدر آباد، دکن) اس روایت میں حضرت عبادہ ''العام المقبل'' میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں'' اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آ کر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعتِ عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام عقبۂ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعتِ عقبہ کا عنوان دیتے ہیں، یعنی ایک یہ بیعتِ عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعتِ عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعتِ عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے، انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعتِ عقبۂ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول ص ۳۰۶ و ص ۳۱۶ و ص ۳۱۷ و زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۶۲ و ص ۳۶۷)''س''

(۲) یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیوں کہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں، ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے، اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم کا پہلے سے موجود ہونا، ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث، انصار بدریین ص ۳۲، واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ پر ایمان لا چکے تھے (بعضوں نے ابوالہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامتؓ کو جگہ دی ہے)''س''۔

۱۔ ابوالہیثمؓ بن تیہان

۲۔ ابوامامہ اسعدؓ بن زرارہ (صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے) ا ھ میں وفات پائی۔

۳۔ عوفؓ بن حارث (بدر میں شہادت پائی)

۴۔ رافعؓ بن مالک بن عجلان اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کو عنایت فرمایا، جنگِ احد میں شہید ہوئے۔

۵۔ قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ (تینوں عقبات میں شریک رہے)

۶۔ جابرؓ بن عبداللہ (بن ریاب) (یہ مشہور صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ بن عمرو کے علاوہ تھے، بدر وغیرہ میں شریک تھے)۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ اانبوی: دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا، مصعبؓ ہاشم بن عبدمناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر کی علم برداری کا منصب ان ہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آکر اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے، جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے، رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا، صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے، ابنِ سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں(۱)

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے، مصعبؓ نے جب ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پتھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام

(۱) (ج اقسم اول ص ۱۴۸) "ض"۔

قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعتِ عقبۂ ثانیہ ۱۲ نبوی: اگلے سال بہتر شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر بہ مقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، انہوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا ''گروہِ خزرج! محمد ﷺ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو'' (۱)۔

حضرت براءؓ نے آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا ''ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں''۔ وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثم نے بات کاٹ کر کہا ''یا رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپؐ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں''۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا ''نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں''۔

آپؐ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کئے، جن کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے، ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے نام حسبِ روایت ابن سعد (۲) حسب ذیل ہیں:

۱۔	اسیدؓ بن حضیر	جنگِ بعاث میں ان ہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔	ابوالہیثمؓ بن تیہان	
۳۔	سعدؓ بن خیثمہ	جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔	اسعدؓ بن زرارہ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا، یہ امامِ نماز تھے۔
۵۔	سعدؓ بن الربیع	جنگِ احد میں شہید ہوئے۔
۶۔	عبداللہؓ بن رواحۃ	مشہور شاعر ہیں، جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔	سعدؓ بن عبادہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں، سقیفہ بنی ساعدہ میں ان ہی

(۱) (یہ اور بعد کی تفصیل بھی طبقات ج ۱ ص ۱۴۹ و ۱۵۰ پر ہے) ''ض''۔ (۲) یہ نام ابن ہشام نے بھی لکھے ہیں (ج ۱ ص ۲۶۷ و ۲۶۸) ''ض''۔

نے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔

۸۔	منذرؓ بن عمرو	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔	براءؓ بن معرور	بیعتِ عقبہ میں ان ہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی، آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔	عبداللہ بن عمروؓ	جنگِ احد میں شہید ہوئے۔
۱۱۔	عبادہؓ بن الصامت	مشہور صحابی ہیں، ان سے اکثر حدیثیں مروی ہیں۔
۱۲۔	رافعؓ بن مالک	جنگِ احد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی، یہ تھیں ''شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور افتراء کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ ان سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہ کریں گے''۔(۱)

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو اسعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا ''بھائیو! یہ بھی خبر ہے؟ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ ہے''۔ سب نے کہا ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کئے گئے رئیس القبائل تھے، ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا، صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے، ان کو اس بیعت کی خبر نہ تھی، انہوں نے تکذیب کی کہ ''ایسا ہوتا تو ہم سے کیوں کر چھپ سکتا تھا''۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی، لیکن چوری چھپے لوگوں نے

(۱) یہ صحیح بخاری کی روایت ہے (باب وفود الانصار الی النبیؐ بمکۃ و بیعۃ العقبۃ ج۱ ص۵۵۰) ''ض'' سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبہ اولیٰ کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپؐ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

ہجرت شروع کردی، رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت ان ہی کی شان میں ہے :

وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ	کمزور مرد، عورتیں اور بچے، جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو
الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ	اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔
الظَّالِمِ اَهْلُهَا (نساء۴ : ۷۵)	

۱ ؍ ہجری

ہجرت

(اس وقت جب کہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دار الامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا، لیکن خود وجودِ اقدس ﷺ جوان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لئے حکمِ خدا کا منتظر تھا، مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے، وہ جاں نثارانہ آپ ﷺ کی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے، قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمروؓ نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپؐ یہاں ہجرت کر آئیں، لیکن آپؐ نے انکار فرمایا (۱) اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا، (۲) لیکن کارسازِ قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا، چنانچہ قبلِ ہجرت آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا کہ دار الہجرۃ ایک پر باغ و بہار مقام ہے، خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا، لیکن وہ شہر مدینہ نکلا)۔(۳)

نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحیِ الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا، یہ داستان نہایت پر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں، لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ ان ہی سے سن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۱ ص ۵۸ کتاب الایمان باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر "ض"۔(۲) مستدرک جلد ۲ ص ۶۱۳ و زرقانی علی المواہب جلد اول ص ۳۵۹۔(۳) (صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی ﷺ) "س" (ج ۱ ص ۵۵۱) "ض"

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے، اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا، اجلاسِ عام کیا، ہر قبیلہ کے روٴسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعۃ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ و منبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں، ایک نے کہا ''محمدؐ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے'' دوسرے نے کہا ''جلاوطن کر دینا کافی ہے''۔ ابوجہل نے کہا ''ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے''۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے آستانۂ مبارک کا محاصرہ کر لیا، اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپؐ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ ''مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میری پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا''۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ ﷺ کا بسترِ خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتحِ خیبر کے لئے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا ''کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو''۔ بولے کہ ''یہاں آپؐ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے''۔ (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی) آپؐ نے فرمایا ''مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے''۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا ''میرا باپ آپؐ پر فدا ہو کیا مجھ کو بھی ہم راہی کا شرف

حاصل ہوگا''؟ ارشاد ہوا''ہاں'' حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لئے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپؐ پسند فرمائیں، محسنِ عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہوسکتا تھا، ارشاد ہوا''اچھا مگر بہ قیمت'' حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا، حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں، ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا، ناشتہ دان میں رکھا، نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا، یہ وہ شرف تھا، جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے(۱)۔

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کردیا، آنحضرت ﷺ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا'' مکہ، تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے''۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جاکر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے(۲)، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی شام کو آکر آنحضرت ﷺ سے عرض کرتے، حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے، تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشامؒ نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گذریں(۳)۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علیؓ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جاکر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا(۴)، پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آگئے، آہٹ پاکر حضرت ابوبکرؓ

---

(۱) (صحیح بخاری باب الہجرۃ)''س'' (ج۱ص۵۵۳)''ض'' (۲) یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی (ج۱ص۳۸۰)''س''۔ (۳) ابن ہشام (ج۱ص ۲۹۲)''ض'' یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ ج۱ص۵۵۳ و بعد میں ہے، باب مناقب المہاجرین میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کرلئے ہیں۔ (۴) تاریخ طبری (ج۳ص۱۲۳۴)''س''

غم زدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ''اب دشمن اس قدر قریب آگئے کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے'' آپؐ نے فرمایا (۱)

لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا　　(توبہ۔۹ : ۴۰)　　گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آگئے تو خدا نے حکم دیا، دفعتاً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپالیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے، حرم کے کبوتر ان ہی کبوتروں کی نسل سے ہیں، اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے(۲) اور زرقانی نے بزار وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں (۳) لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں، اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امامِ فنِ رجال یحیٰی بن معین کا قول ہے، ''لا شیئی ''یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ ''وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے'' اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال (۴) میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے (۵)۔

بہر حال چوتھے دن آپؐ غار سے نکلے، عبداللہ بن اُریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کرلیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھادی، آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرارہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد وغبار سے صاف کردے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپؐ نے پی کر فرمایا کہ ''کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا''؟ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپؐ

---

(۱) صحیح بخاری باب مناقب المهاجرین و فضلهم منهم ابوبکر الخ ج۱ص ۵۱۶۔(۲) (ج۱ص۳۸۴ و ۳۸۵)''ض'' (۳) (ج ۱ص۳۸۴)''ض'' (۴) (ج۲ص۳۰۹)''ض'' (۵) (سیرۃ النبی ج ۳ص ۲۶۳ تا ۲۶۹ طبع جدید ۱۹۹۸ء میں بہ ضمن ''مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت'' ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے)''س''۔

وہاں سے روانہ ہوئے (۱)

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خوں بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم (۲) نے سنا تو انعام کی امید میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپؐ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟ جواب میں ''نہیں'' نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربے نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں، آنحضرت ﷺ کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے، حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہؓ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا (۳)۔

حسنِ اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے، جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔ (۴)

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں، اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، خرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجہ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپؐ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذاسلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبہ، عقیق، جثجاثہ۔ (۵)

---

(۱) یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین (ج ۱ ص ۵۱۵) ''ض'' میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ (۲) سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے ان ہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا۔ (۳) صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی ﷺ (ج ۱ ص ۵۵۴) ''ض'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔ (۴) (صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی ج ۱ ص ۵۵۴) ''ض''۔ (۵) ج ۱ ص ۱۵۷۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشمِ انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ "پیغمبر ﷺ آ رہے ہیں" لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہلِ عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا" (۱) تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے، اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں، یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثومؓ بن الہدم خاندان کے افسر تھے، آنحضرت ﷺ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دو عالم ﷺ نے ان ہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے (۲)۔

اکثر اکابر صحابہؓ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی ان ہی کے گھر میں اترے تھے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہؓ بن مخرمۃ، وہبؓ بن سعدؓ، معمرؓ بن ابی سرحؓ، عمروؓ بن ابی عمرو، عمیرؓ بن عوفؓ، اب تک ان ہی کے مہمان تھے۔ (۳)

جنابِ امیرؓ آنحضرت ﷺ کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے، وہ بھی آ گئے اور یہیں ٹھہرے، تمام مورخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا، لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے (۴) اور یہی قرین قیاس ہے۔

یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا، حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المناقب باب ھجرۃ النبیؐ واصحابه الی المدینة ج ۱ ص ۵۵۵۔ (۲) صحیح بخاری صفحہ ۳۶۰ (باب ھجرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۳۵۵ میں ابن شہاب نے عروہ بن زبیر کے حوالے سے بنی عمرو بن عوف کے یہاں رسول اللہ ﷺ کے قیام فرمانے کا ذکر کیا ہے اور اسی باب میں ص ۳۵۶ پر انس بن مالک کی روایت سے انصار کے سلام عرض کرنے کا ذکر ملتا ہے) "ض" طبقات ابن سعد سیرت نبوی صفحہ ۱۵۸ (۳) ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ہدم جزء ثالث القسم الثانی فی البدریین من الانصار ص ۱۴۹ و ۱۵۰ (۴) (باب مقدم النبیؐ و اصحابه الی المدینة ج ۱ ص ۵۶۰) "ض"

کھجوریں سکھلائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے :

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ . (توبہ۔۹ : ۱۰۸)	وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پر ہیز گاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپؐ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسمِ مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپ ﷺ چھوڑ دیں، ہم اٹھالیں گے"۔ آپ ﷺ ان کی درخواست قبول فرماتے لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے (۱)۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

افلح من يعالج المساجدا	وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے۔
ويقرء القرآن قائما وقاعدا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔
ولا يبيت الليل عنه راقدا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔

آنحضرت ﷺ بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے (۲)

قباء میں آپؐ کا داخلہ اسلام کے دورِ خاص کی ابتدا ہے، اس لئے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳، اسکندری کی دسویں تاریخ تھی (۳) مورخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔ (۴)

---

(۱) وفاء الوفاء بہ حوالہ طبرانی کبیر (جلد اصفحہ ۱۸۰) (۲) وفاء الوفاء بحوالہ ابن شبہ ج اص ۱۸۱ مصر۔ (۳) عینی شرح بخاری جلد دوم ص ۳۵۴ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۷۳۳ سبعمایہ لکھا گیا ہے، اس کو تسعمایہ پڑھنا چاہئے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعرات کا دن بتایا ہے، لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے)۔ (۴) (ج ۲ ص ۴۱) "ض"

آفتاب	برجِ سرطان میں	۲۳ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برجِ اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برجِ حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برجِ اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برجِ اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) (۱) آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، (راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آ گیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی نمازِ جمعہ اور سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے) آپ کے ننہالی رشتہ دار بنونجار ہتھیار سج سج کر آئے (۲) قباء سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا ”حضور! یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے“۔ آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں: (۳)

---

(۱) خوارزمی کے حساب کے مطابق روزِ ورود (جمعرات) نہ لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ (۲) یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے (ہتھیار سج سج کر آنے کا ذکر باب هجرة النبی ج ۱ ص ۵۵۶ پر ہے اور یہ روایت صحیح مسلم كتاب المساجد ومواضع الصلوٰة باب ابتناء مسجد النبی ج ۱ ص ۱۹۸ میں بھی ہے، جمعہ کا ذکر طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۶۰ اور ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۷ پر ہے) ”ض“ (۳) وفاء الوفاء جلد اول ص ۱۸۷، پہلے اشعار کے متعلق زرقانی (ج ۱ ص ۴۱۶ تا ۴۱۸) ”ض“ میں نہایت محققانہ، محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کئے ہیں (ج ۱ ص ۴۱۶) ”ض“ بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر (غزوۂ تبوک کے بعد كتاب النبی الی کسری و قیصر کے باب ص ۶۳۷ میں امام بخاری نے حضرت سائب بن یزید کا یہ قول نقل کیا ہے ”اذكرانی خرجت مع الصبيان نتلقى النبی الی ثنيته الوداع مقدمه من غزوة تبوک“ اس کی مزید تفصیل فتح الباری ج ۸ ص ۹۸ پر ملاحظہ ہو) ”ض“، لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔

طلع البدر علینا	چاند نکل آیا ہے۔
من ثنیات الوداع	کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے
وجب الشکر علینا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
ما دعیٰ للہ داع	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں:

نحن جوار من بنی النجار	ہم خاندانِ نجار کی لڑکیاں ہیں۔
یا حبّذا محمدا من جار	محمد ﷺ کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

آپؐ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا ''کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟ بولیں ''ہاں'' فرمایا کہ ''میں بھی تم کو چاہتا ہوں''۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے، اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا، کوکبۂ نبویؐ یہاں پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپؐ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابوایوبؓ کے حصہ میں آئی۔(۱)

حضرت ابوایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپؐ نے زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا، ابوایوبؓ دو وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپؐ جو چھوڑ دیتے، ابوایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا، کھانے میں جہاں آنحضرت ﷺ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوبؓ بھی تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

(۱) ابوایوبؓ کا نام خالد ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے (ج ۲ ص ۹ مطبعہ سعادۃ مصر) ''ض''، اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ ''میرے ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے'' چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوبؓ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا، اس لئے آپؐ نے ان ہی کے گھر پر قیام فرمایا (وفاء الوفاء ج اص ۱۸۷) ''ض''، لیکن صحیح مسلم باب (فی حدیث الہجرۃ الخ ج ۲ ص ۵۵۴) ''ض'' میں ہے کہ جب لوگوں میں آپؐ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپؐ نے کہا کہ ''میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں''۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابوایوبؓ اسی خاندان سے تھے امام بخاری نے تاریخِ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا (وفاء الوفاء ج اص ۱۸۷) روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی بکر مضی النبی ﷺ وانا معه حتی اتینا المدینة لیلا فنازعه القوم ایهم ینزل علیه فقال النبی ﷺ انی انزل اللیلة علی بنی النجار اکرمهم بذلک الخ ص ۱۴ و ۱۵) ''ض''

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے (۱)۔

آنحضرت ﷺ نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا، اس اثنا میں جب مسجدِ نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپؐ نے نقلِ مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آ کر آپؐ نے حضرت زیدؓ (اور اپنے غلام ابورافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحب زادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں، آنحضرت ﷺ کی صاحب زادیوں میں سے حضرت رقیہؓ، حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا، زیدؓ صرف حضرت فاطمہ زہراؓ (اور حضرت ام کلثومؓ) اور حضرت سودہؓ (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کے ساتھ آئیں (۲)۔

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر: مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں (یا جہاں موقع ملتا تھا) آپؐ نماز پڑھا کرتے تھے (۳)، دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں" وہ بولے کہ "ہم قیمت لیں گے لیکن آپ سے نہیں، بلکہ خدا سے" چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپؐ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی، لیکن آپ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابوایوبؓ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہِ دو عالمؐ پھر مزدوروں کے لباس میں تھا، صحابہؓ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے (۴)۔

---

(۱) اصابہ ذکر ابوایوبؓ (ج ۲ ص ۹۰ مطبع سعادۃ مصر) "ض" اور زرقانی بہ حوالہ قاضی ابو یوسف و حاکم (ج ۱ ص ۴۱۴ و ۴۱۵) "ض" و وفاء الوفاء (ج ۱ ص ۱۸۸ و ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۹) "ض"۔ (۲) ابن سعد (جزء نساء ص ۴۳)۔ (۳) ابوداؤد (کتاب الصلوۃ باب فی بناء المسجد "س") (ج ۱ ص ۶۵) "ض"۔ (۴) بخاری (کتاب الصلوۃ باب هل ینبش قبور مشرکی الجاهلیة و یتخذ مکانها مساجد ج ۱ ص ۱۶) "ض" و کتاب المناقب باب دعاء النبیؐ اصلح الانصار والمهاجرہ ج ۱ ص ۵۳۵ و باب الهجرة (ج ۱ ص ۵۵۵) "ض" و ج ۱ و باب البیوع و عینی شرح بخاری ج ۲ ص ۳۵۷ و زرقانی (ج ۱ ص ۳۲۲ و ما بعد) "ض"

اللّٰھم لا خیر الاخیر الآخرۃ　　اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔

فاغفر الانصار والمھاجرۃ　　اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر، کھجور کے ستون تھے، قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہ نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں، آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگ ریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا، جو صفہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے (۱)

مسجدِ نبویؐ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ کے لئے مکان بنوائے، اس وقت تک حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ عقدِ نکاح میں آ چکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنے، جب اور ازواج آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے، یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے جو حجرے اینٹوں کے تھے، ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے، ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہؓ حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں (۲)، یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپؐ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواجِ مطہراتؓ گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے، چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمل کا پردہ پڑا رہتا تھا (۳)، راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ (۴)

آنحضرت ﷺ کے ہم سایہ میں جو انصار رہتے تھے، ان میں حضرت سعدؓ بن عبادہ،

---

(۱) (زرقانی ج ۱ ص ۳۲۹ و ۳۳۰) "ض" (۲) طبقات ابن سعد جلد سیرت نبویؐ ص ۱۶۱ (۳) منازلِ نبوی کا حال طبقات ابن سعد جزء ۸ ص ۱۱۷ اور وفاء الوفاء (ج ۱ ص ۳۲۵ و بعد) میں تفصیلاً ہے (۴) بخاری باب الصلوۃ علی الفراش ج ۱ ص ۵۶

حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت عمارۃؓ بن حزم اور حضرت ابوایوبؓ رئیس اور دولت مند تھے، یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور اسی پر آپؐ بسر فرماتے تھے، حضرت سعدؓ ابن عبادہ نے التزام کرلیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے جس میں کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا (۱) حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام انسؓ نے اپنی جائداد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی، آنحضرت ﷺ نے قبول فرما کر اپنی دایہ حضرت ام ایمنؓ کو دے دیا (۲) اور خود فقر وفاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتداء: اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت واجتماع ہے، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نمازِ جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ (وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے) آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہ تھا، آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کردیئے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں، لیکن اس میں زحمت تھی، صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کردیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے، آپؐ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں اعلانِ نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپؐ کی خدمت میں عرض کئے گئے، لیکن آپؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں (۳)، اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاعِ عام ہوجاتی تھی، دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوتِ اسلام کا اعلان ہوجاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا، لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی (۴)۔

---

(۱) طبقات ابن سعد جلد کتاب النساء ص ۱۱۶۔ (۲) صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۵۸ باب فضل المنیحہ (۳) ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب بدء الاذان (ج ۱ ص ۷۱) ''ض''، و بخاری کتاب الاذان (باب بدء الاذان ج ۱ ص ۸۵) ''ض''، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔ (۴) (یہ روایت صحیح بخاری (ج ۱ ص ۸۵) کے علاوہ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۵۰) ''ض'' نسائی کتاب الاذان باب بدء الاذان ج ۱ ص ۷۳ اور ترمذی (ابواب الصلوۃ باب ما جاء فی بدء الاذان ج ۱ ص ۴۸) ''ض'' میں بھی ہے، لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کی رایوں کے مقابلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کردے، آنحضرت ﷺ نے ان (بقیہ حاشیہ ص ۲۰۴ پر)

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپؐ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا، خواب کا ذکر نہیں۔

مواخات: مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے، گوان میں دولت مند اور خوش حال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

اگر چہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی، مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ بالکل نکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے، جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دہ سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا ''یہ تمہارے بھائی ہیں'' پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے، انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے، سعدؓ بن الربیع جو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیجئے، لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا (۱)۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۳) کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت ﷺ نے اس کو من جانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی، فتح الباری ج ۲ ص ۶۲ و بعدہ و نووی و زرقانی (ج ۱ ص ۳۴۴ و بعد) ''ض'' و روض الانف باب بدء الاذان ج ۲ ص ۱۱۹ تا ۱۲۱ میں یہ تفصیلات بہ حوالہ و سند مذکور ہیں۔) ''س''

(۱) مواخات کا ذکر اور ایک ایک کا نام، ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۰۴ و ۳۰۵) ''ض'' میں ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی (ج ۱ ص ۵۳۳) اور باب کیف اخی النبی بین اصحابہ ج ۱ ص ۵۶۱) ''ض'' میں ہے۔

انصار کا مال و دولت، جو کچھ تھا، نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں (۱) انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا، سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے، جو کچھ پیداوار ہوگی اس میں نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا (۲)۔

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجرین کو ملتا تھا (۳) اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل تھی:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال۔۸:۷۲)	جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔

جنگِ بدر کے بعد مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی، تو یہ آیت اتری:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ (انفال۔۸:۷۵)	ارباب قرابت ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا، چنانچہ کتبِ تفسیر وحدیث میں بہ تصریح مذکور ہے۔

۴ ھ میں بنو نضیر جب جلا وطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ "مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیئے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو"، انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی ان ہی کو عنایت فرمایئے۔ (۴)

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی، لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا، حضرت سعدؓ بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی، تو انہوں نے کہا "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ انہوں نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا، جا کر راستہ بتا دیا، انہوں نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا

(۱) صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۱۳۔ (۲) صحیح بخاری ابواب الحرث و المزارعۃ باب اذا قال اکفنی مؤنۃ النخل الخ ج ۱ ص ۳۱۲ "ض"۔ (۳) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ نساء باب وَلِکُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ الخ ج ۲ ص ۶۵۹۔ (۴) فتوح البلدان مطبوعہ یورپ ص ۲۰۔

اور شام تک خرید و فروخت کی، چند روز میں اتنا سرمایہ ہوگیا کہ شادی کر لی (۱) رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے، ان کا اسبابِ تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی (۲)۔

بعض صحابہؓ نے دوکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ مقام سنخ میں تھا، جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے (۳)، حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے (۴)، حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہوگئے تھے (۵) اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی (۶) اور صحابہ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی، صحیح بخاری (۷) میں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرتِ روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا ''اس میں میرا کیا قصور ہے اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتا تھا''۔

پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیئے، صحیح مسلم باب الجہاد (۸) میں ہے۔

ان رسول اللہ ﷺ لما فرغ من قتال اھل خیبر وانصرف الی المدینۃ رد المھاجرون الی الانصار منائحھم التی کانوا منحوھم من ثمارھم۔

آنحضرت ﷺ جب جنگِ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیئے۔

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں، ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیئے، سب سے پہلے حضرت حارثہؓ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی، بنو زہرہ مسجدِ نبوی کے عقب میں آباد ہوئے، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہوگا)

(۱) صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے (کتاب البیوع (باب ما جاء فی قول اللہ فاذا قضیت الصلوۃ الخ ج۱ ص۲۷۵ و باب کیف آخی النبی ﷺ (ج۱ ص۱۶۵) ''ض'' باب اخاء النبی بین المھاجرین والانصار باب الولیمہ، ولو بشاۃ (ج۱ ص۵۳۳) ''ض''۔ (۲) اسد الغابہ ج۳ ص۳۱۴ و ۳۱۵ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ (۳) ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۱۔ (۴) مسند امام ابن حنبل جلد ۱ ص ۶۲۔ (۵) مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۴۰۰ (۶) ابن حنبل جلد ۳ ص ۳۴۷۔ (۷) (کتاب العلم باب حفظ العلم ج۱ ص۲۲) ''ض''۔ (۸) (باب ردالمھاجرین الی الانصار منائحھم الخ ج۲ ص۷۸) ''ض''

بنوایا، حضرت زبیرؓ بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی، حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں (۱)

مواخات کے رشتہ سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں: (۲)

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ	حضرت خارجہؓ بن زید انصاری (۳)
حضرت عمرؓ	حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری
حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامۃؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمار بن یاسرؓ	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذرؓ بن عمرو
حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابودرداؓ
حضرت بلالؓ	حضرت ابورویحہؓ
حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	حضرت عبادؓ بن بشر
حضرت سعیدؓ بن زیدؓ بن عمرو بن نفیل	حضرت ابیؓ بن کعب

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراضِ اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام تہذیبِ اخلاق و تکمیلِ فضائل کی شاہنشاہی ہے، اس سلطنتِ الٰہی کے لئے وزراء، اربابِ تدبیر، سپہ سالارانِ لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں، شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین

(۱) یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے (جلد ۷ ص ۴۳۰) "ض"۔ (۲) یہ تفصیل ابن ہشام (ج ا ص ۳۰۴ و ۳۰۵) میں (اور ناموں کے اضافہ کے ساتھ) ہے۔ "ض" (۳) ابن ہشام نے خارجہ بن زہیر لکھا ہے "ض"۔

میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درس گاہِ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا، ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحادِ مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضرور ہے، تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحادِ مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے والد زید آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے، حضرت سعیدؓ نے ان ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی، اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ انہوں نے لبیک کہا، ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں، حضرت عمرؓ ان ہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے، علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے، ان کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی، جنہوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہِ نبوت میں منصبِ انشاء پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے، فنِ قرأت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں (۱)

حضرت ابو حذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیسِ اعظم تھا، اس مناسبت سے ان کو حضرت عبادؓ بن بشر کا بھائی بنایا گیا، جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابو عبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ ﷺ نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتحِ شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوۂ بدر میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے پہلے حقوقِ ابوت کی مراعات کی، لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو نثار کر دینا پڑا، ان کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیئے گئے، جو قبیلۂ اوس کے رئیسِ اعظم تھے، ان میں بھی ایثار

(۱) اصابہ ذکر ابیؓ بن کعب ج ۱ ص ۱۶۔

کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بنو قریظہ ان کے حلیف تھے اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا، تاہم غزوۂ بنی قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلالؓ اور حضرت ابورویحہؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابودرداءؓ، حضرت عمارؓ ابن یاسر اور حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت مصعبؓ اور حضرت ابوایوبؓ میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بہ دولت نہ صرف شاگرد بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف مدینہ میں آئے تو پنیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے، حضرت سعدؓ بن الربیع کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے، دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے، ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، انہوں نے عرض کی کہ ”پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرما لیجئے، تب ہم لینا منظور کریں گے“۔(۱)

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپؐ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ ”صرف پانی“ آپؐ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے؟ جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے، حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کی ”میں حاضر ہوں“ غرض وہ اپنے گھر لوا گئے، لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے، انہوں نے بیوی سے کہا چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے، میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ (۲) کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے :

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ — اور گو ان کو خود تنگی ہوتا ہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ (حشر۔۵۹: ۹)

صفہ اور اصحابِ صفہ: اصحابِ صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت

(۱) صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل انصار باب اخاء النبیؐ ج ۱ص ۵۳۴۔ (۲) صحیح بخاری و فتح الباری، فضائل الانصار۔

سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

''صفہ'' سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہ میں سے اکثر تو مشاغلِ دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے، لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت ﷺ کی تربیت پذیری پر نذر کردی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے، حضرت ابوہریرہؓ بھی ان ہی لوگوں میں تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہہ دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہوسکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں، یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آکر شریکِ نماز ہوتے، لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں (۱) آنحضرت ﷺ کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت ﷺ ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسّی اسّی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے (۲)۔ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے

(۱) صحیح ترمذی (ابواب الزھد) ''ض'' باب معیشۃ اصحاب النبی ﷺ (ج ۲ ص ۶۲) ''ض''۔ (۲) زرقانی (ج ۱ ص ۴۴۷ مصر) ذکر اصحابِ صفہ و مسجد نبویؐ۔

نیل پڑگئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ ''یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں'' (۱) راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا، اس کے پاس جا کر پڑھتے (۲)، اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوتِ اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ میں ان ہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی، لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی، نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی، ان لوگوں کا مفصل (۳) حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۰۴ھ (جو ابن مندہ کے استاد تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے، سلمی نے بھی ان کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔ (۴)

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ: مورخینِ عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا، لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، یہود گو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں، اسرائیلی نام رکھتے ہیں، بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ — تم مع اپنے خدا کے جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

(مائدہ۔۵ : ۲۴)

---

(۱) زرقانی (ج ۱ ص ۴۴۷ دار الطباعۃ میریہ مصر) ذکر اصحاب صفہ۔ (۲) مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷۔ (۳) (حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام میں لکھا ہے، اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں) (۴) اصحاب صفہ کا حال بخاری کتاب الصلوۃ کتاب مواقیت الصلوۃ، کتاب المناقب اور کتاب البیوع باب ماجاء فی قول اللہ فاذا قضیت الصلوۃ الخ ج ۱ ص ۲۷۴ میں اور جلد دوم کتاب الخمس، کتاب الاستئذان، کتاب الرقاق۔ وغیرہ اور صحیح مسلم (کتاب الامارۃ) ''ض'' میں جستہ جستہ مذکور ہے، زرقانی نے اور کتابوں سے لے کر اضافہ کیا ہے (ج ۱ ص ۴۲۹ تا ۴۳۲) ''ض'' میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالہ سے لکھے ہیں (نیز مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۷ میں بھی ہیں)۔

بخلاف اس (۱) کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔

ان قرائنِ عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم کانت وقعة بنی نضیر وهم فخذ من جذام الا انهم تهو دوا .... وكذلك قريظة (۲)	پھر بنونضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ (۳) میں ایک روایت لکھی ہے کہ "یہ جذام کے قبیلہ سے تھے، کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور شام سے نقلِ مکان کر کے حجاز چلے آئے"۔

یہ تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنالئے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج، ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا، جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے (۴) خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خوں بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

---

(۱) مسٹر مارگولیتھ نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلانِ رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصل یہود بھی تھے، عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

(۲) یعقوبی جلد ۲ ص ۴۹۔ (۳) مطبوعہ یورپ ص ۲۴۷۔ (۴) (ج ۱ ص ۳۰۱ تا ۳۰۳) "ض"

۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریکِ یک دگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریکِ صلح ہوگا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

واقعاتِ متفرقہ: اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربینِ خاص میں تھے، وفات پائی، حضرت کلثومؓ بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قبا میں تشریف لائے تو ان ہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہ بھی ان ہی کے گھر اترے تھے، حضرت اسعدؓ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا، یہی اسعدؓ تھے (۱)، یہ فخر بھی ان ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی۔ (۲)

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے، چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میں خود تمہارا نقیب ہوں'' (۳)۔ چونکہ آپ ﷺ کی نہال اسی قبیلہ میں تھی اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافرت کا موقع نہ تھا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت ﷺ کو نہایت صدمہ ہوا، منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ ''محمد ﷺ اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا'' آپؐ نے سنا تو فرمایا:

لا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شئیا — میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ (طبری ج ۳ ص ۱۲۶۰)

---

(۱) (طبقات ج ۱ ص ۱۴۶۔)''ض'' (۲) (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۸)''ض'' (۳) طبری ج ۳ ص ۱۲۶۱ و ۱۲۶۲۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی، یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمروؓ بن عاص ہیں، جو فاتحِ مصر اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ولادت ہوئی ، ان کے والد حضرت زبیرؓ آنحضرت ﷺ کے پھوپھیرے بھائی تھے، اور ان کی والدہ (حضرت اسماء) حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی اور حضرت عائشہؓ کی بے مات بہن تھیں، اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی ، اس لئے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں ، اب ظہر، عصر، عشاء میں چار چار ہو گئیں، لیکن سفر کے لئے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

﴿☆﴾

۲/ہجری

تحویلِ قبلہ وآغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے، جواب ۴۵ کرور قلوب کا مرکز ہے(۱) دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں)

تحویلِ قبلہ شعبان ۲/ہجری: ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہوسکتی، اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا، جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم واسرار کا جامع ہے، اسلام کا خاص نمایاں وصف مساواتِ عام، جمہوریت اور توحید عمل ہے، یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہت نظر آئیں، مذہبِ اسلام کا رکن اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے، نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے، اسی بنا پر نمازِ جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے، اس لئے ضرور ہے کہ سب کا مرجعِ عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہے جس کی بنا پر نماز کا ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے، اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس

(۱) اب یہ تعداد ایک ارب سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ''ض''

سمت قرار دیا جائے، یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیوں کہ ان کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی، لیکن ابراہیمؑ بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہوسکتا تھا، جو اس موحدِ اعظم کی یادگار اور توحیدِ خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب تک مکہ میں تھے، دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں، ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے، یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی، کیوں کہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ مقامِ ابراہیمؑ کے سامنے نماز ادا کرتے تھے، جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے مدینہ میں دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا، اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے، شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ایک مدت یعنی تقریباً سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی، لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کیا جاتا، اس بنا پر یہ آیت اتری اور دفعتاً قبلہ بدل گیا (۱)۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرۃ۔۲ : ۱۴۴)	تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں رہو اسی طرف منہ پھیرو۔

تحویلِ قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی ان کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے، یہاں تک کہ (جیسا ابوداؤد (۲) میں روایت ہے) جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے، اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا، تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا، اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی ان ہی کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے، جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز

(۱) اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز کتاب الصلوۃ باب التوجہ نحو القبلۃ ج ۱ ص ۵۷ و فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۲۱ و ۴۲۲ و صحیح بخاری کتاب التفسیر قبلہ سے متعلق ابواب ج ۲ ص ۶۴۵ و فتح الباری ج ۸ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ سے ماخوذ ہیں۔ "س" (۲) (کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام ج ۲ ص ۳۶۵ کلکتہ) "ض"

ہو گیا، انہوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد ﷺ چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں، اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے، دودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزلِ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے، اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویلِ قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہوتی ہیں:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (بقرہ۔۲ : ۱۴۲)	سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا، اس سے ان کو کس نے پھیر دیا، کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (بقرہ۔۲ : ۱۴۳)	تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بجز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے۔
لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ (بقرہ۔۲ : ۱۷۷)	پورب پچھم رخ کرنا یہی کوئی ثواب کی بات نہیں، ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، خدا ہر جگہ ہے، ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے اور اصلی اور نمایشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے، بہت سے یہودی تھے، جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے، یہ اسلام کے لئے مارِ آستین تھے، لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا، کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے، پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کرنا اصلی ثواب نہیں، بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

سلسلۂ غزوات (۱)

کیا عجیب بات ہے، اربابِ سیر، مغازی کی داستان جس قدر زیادہ درازنفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے، کیوں کہ اس کو اسلام کے جور وستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے، اس کے نقش و نگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں، بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مورخوں نے سیرتِ نبوی ﷺ کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔

لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے، اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا، مصائبِ گوناگوں کا آماج گاہ تھا، مدینہ میں آکر اس کی کلفتیں دور ہوئیں، مگر یہ خیال صحیح نہیں، مکہ میں جو مصیبت تھی، گو سخت تھی لیکن تنہا اور منفرد تھی، مدینہ میں آکر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی، مکہ کل ایک قوم تھا، مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے، جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریفِ مقابل تھے، اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا، جو مارِ آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعتِ اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں، لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا، مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ وغضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو واقعۂ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاج پوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے

(۱) غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، کیوں کہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گذر جائیں۔ اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے، ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

لئے تیاری کر لی تھی (۱) خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

انکم آویتم صاحبنا و انا نقسم باللّٰہ لتقاتلنہ او تخرجنہ او لنسیرنّ الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نسآئکم	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔
(سنن ابوداؤد ص ۶۷ ج ۲ باب خبر النضیر)	

جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے، اس کو سمجھایا کہ ''کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے''، چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا، بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہودِ مدینہ کا سر پھر چکا تھا، اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت ﷺ بنوالحارث بن خزرج کے محلّہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، ایک جگہ مشرکین و منافقینِ مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے، گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا اور حقارت سے بولا ''گرد نہ اڑاؤ''۔ آنحضرت ﷺ نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں، عبداللہ نے کہا (۲) ''اے شخص مجھ کو یہ پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو''۔ مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے، اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے، آخر آنحضرت ﷺ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔)

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے، عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے، امیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا، اس تعلق سے حضرت سعدؓ اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے، ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابوجہل سامنے آ گیا، امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا ''سعد ہیں'' ابوجہل نے کہا 'تم لوگوں نے صابیوں (کفار، آنحضرت ﷺ اور اہلِ اسلام کو صابی یعنی

(۱) بخاری کتاب الاستیذان باب (التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین) ''س'' ج ۲ ص ۹۲۴ (۲) صحیح مسلم (باب فی دعاء النبیؐ الی اللّٰہ و صبرہ علی اذی المنافقین) ''ض'' صفحہ ۹۳ جلد ۲ و بخاری باب مذکور۔

مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے، میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو، خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے" حضرت سعدؓ نے کہا "اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے" (۱) (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)۔

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے، سب قریش کے زیر اثر تھے (۲) اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا، ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے، چنانچہ ۶ ہجری میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپؐ تک پہنچنے نہیں دیتے، اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے، آپؐ کی خدمت میں آسکتے ہیں (۳)۔

قریش نے ان ہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں، مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، صحیح نسائی میں ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اول ماقدم المدینۃ یسھر من اللیل (۴)	آنحضرت ﷺ اول جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا" چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپؐ نے آرام فرمایا (۵) اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں:

عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللہ ﷺ واصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانوا لایبیتون	آنحضرت ﷺ اور صحابہ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے، صحابہ (رضی اللہ عنہم) صبح تک

(۱) یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری کتاب المغازی کی ابتداء میں مذکور ہے (ج ۲ ص ۵۶۳)۔ (۲) ابن ہشام واقعاتِ وفود میں ہے و ذلک ان قریشا کانوا امام الناس ...... وقادۃ العرب لا ینکرون ذلک وکانت قریش ھی التی نصبت الحرب لرسول اللہ ﷺ (ج ۲ ص ۳۶۲)۔ (۳) وفد بنی عبدالقیس کے ذکر میں صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۲۷) اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ (۴) فتح الباری ج ۶ ص ۶۰ میں ابو اسحق الفزاری کے واسطہ سے نسائی کی یہ روایت مذکور ہے "ض"۔ (۵) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللہ عز و جل ج ۱ ص ۴۰۴۔

الا بالسلاح ولا یصبحون الافیه (۱) ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔

مورخین، مغازی کی ابتدا ان ہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی، لیکن ایک دقیقہ بیں ان ہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہبِ لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲ر صفر ۲ رہجری میں جہاد کی اجازت دی، اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے (۲)

اول آیة نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصۡرِهِمۡ لَقَدِیۡرٌ ۔

پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے (۳)

وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَكُمۡ اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

(بقرہ۔۲ : ۱۹۰)

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں ان ہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آ کر آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلا کام حفاظتِ خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی، بلکہ انصار کی بھی، کیوں کہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائلِ متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی، اس بنا پر آپؐ نے دو تدبیریں اختیار کیں، اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی، بند کر دی جائے تا کہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یاد ہو گا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے مکہ میں ابو جہل کو اسی کی دھمکی دی تھی، دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب وجوار کے جو قبائل ہیں، ان سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے۔

---

(۱) لباب فی اسباب النزول للسیوطی سورہ نور آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ الخ مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ (۲) زرقانی ج ۱ ص ۴۴۸ بحوالہ صحیح نسائی (علامہ محمد بن عبدالباقی نے اس روایت کو مرفوع بتایا ہے)۔ "ض"

(۳) ج ۲ ص ۱۰۶ تفسیر آیت مذکور۔

بدر سے پہلے کی مہمیں: (غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں، ابواء کی مہم سے پہلے بذاتِ خاص آپؐ نے کسی مہم میں شرکت نہیں کی، اس ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ ہجری میں واقع ہوئی اور جس میں آپؐ نے خود شرکت فرمائی تھی، اربابِ سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے، جن کو ان کی زبان میں ''سریہ'' کہتے ہیں، سریۂ حمزہ، سریۂ عبیدہ بن حارث، سریۂ سعد بن ابی وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا، یا تو بیچ بچاؤ ہو گیا، یا بچ کر نکل گئے، اربابِ سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے، یعنی حضرت سعدؓ کی تہدید کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا، مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہؓ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

جہینہ: اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی، ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے، جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں تعلقات رکھیں گے (۱) یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ ہجری میں آپؐ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے (جس کے قریب ہی غزوۂ ابواء یا غزوۂ وَدّان واقع ہوا) اور جہاں آپؐ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے، ابواء کا صدر مقام فرع ہے، جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلۂ مزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے، یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے، ان اطراف میں قبیلۂ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح ان کی حدودِ حکومت میں داخل تھے، یہاں آپؐ نے چند روز قیام کر کے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا، معاہدہ کے یہ الفاظ تھے:

---

(۱) اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریۂ ضمرہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہینی (رئیسِ قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے کہ کان موادعا للفریقین یعنی اس نے دونوں فریق سے صلح کر رکھی تھی۔

هذا كتاب من محمد رسول الله لبني ضمرة فانهم امنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله مابل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه الخ (۱)

یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے، بنوضمرہ کے لئے، ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی، بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتداء اسی واقعہ سے کرتے ہیں، صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے (۲)۔

قریباً ایک مہینہ کے بعد کُرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا (۳) مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے مویشی لوٹ لئے، اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا، (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتحِ مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے)۔

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینہ آپؐ دوسو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذوالعشیرہ میں پہنچ کر بنومدلج سے معاہدہ کیا، یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواحی میں ہے۔

بنومدلج، بنوضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنوضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کرلیں (۴)۔

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا، یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے، آپؐ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو

(۱) روض الانف (ج ۲ ص ۵۸) و زرقانی ج ۱ ص ۴۵۹۔ (۲) ج ۲ ص ۵۶۳۔ (۳) اصابہ ذکر کرز فہری ج ۳ ص ۲۹۰

(۴) میں تسلیم کرتا ہوں کہ مورخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ''ان کا مقصد قریش کے کارواں کا لوٹنا تھا، لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا'' لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا، اس سے آگے مورخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود نہ حاصل ہو سکا اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت ﷺ کو عیاذاً باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا، یہاں تک کہ بار بار کے تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامیابی ہوئی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا۔

کھولنا، حضرت عبداللہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ ''مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو''۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے، سامنے سے نکلے، حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا، حضرت عبداللہؓ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی''، غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپؐ نے انکار فرمایا، صحابہؓ نے حضرت عبداللہؓ سے نہایت برہم ہو کر کہا:

صنعتم مالم تومروا به وقاتلتم في الشهر الحرام ولم تومروا بقتال (۱)

تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹنا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہ حرام میں لڑے، حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا، عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر معاویہ کا دادا) کا حلیف تھا (۲) حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاستِ عام اسی کو حاصل ہوئی تھی، جو لوگ گرفتار ہوئے، یعنی عثمان ونوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے (۳)، مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالدؓ کا دادا اور حرب کے بعد دوسرے درجہ کا رئیس تھا، اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا اور ثار یعنی انتقامِ خون کی بنیاد قائم ہوگئی، معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے، حضرت عروہؓ بن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں، سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے، علامہ طبری لکھتے ہیں: (۴)

وكان الذى هاج وقعة بدر و سائر الحروب التى كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد بن عبدالله السهمى عمرو بن الحضرمى .

اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں، جو آنحضرت ﷺ اور مشرکینِ قریش میں پیش آئیں، سب کا سبب یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۲۷۵۔ (۲) اصابہ ترجمہ علاء حضرمی ج ۲ ص ۴۹۷۔ (۳) طبری ج ۳ ص ۱۲۷۴۔ (۴) (ص ۱۲۸۴ ''س'') جلد ۳۔

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(آل عمران۔۳:۱۲۳)

رمضان ۲ ھجری: بدر ایک گاؤں کا نام ہے، جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے، یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گذار گھاٹیوں میں سے ہو کر گذرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد ﷺ کو قتل کر دو، یا ہم آ کر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں، کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کر گیا تھا۔

حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا، اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سرو سامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی (۱)

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبارِ تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں، ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا،

---

(۱) ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۷ میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے، واللّٰہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش ءٌ وصاعدا الابعث بہ معنا ، ہمارے مورخین کو اسباب ونتائج کی جستجو نہیں ہوتی، اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا، لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اگل دینے کی ضرورت کیا تھی۔

جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لوٹنے کو آرہے ہیں، قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت ﷺ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے صحابہ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیوں کہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے، جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں، حضرت سعدؓ بن عبادۃ (سردارِ خزرج) نے اٹھ کر کہا "کیا حضور ﷺ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم آپ ﷺ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

یہ صحیح مسلم (۱) کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ "ہم موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے، لڑیں گے" ان کی اس تقریر سے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ چمک اٹھا (۲)۔

غرض ۱۲ر رمضان ۲ رہجری کو آپ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا جو کم عمر تھے، واپس کر دیئے گئے (۳) کہ ایسے پرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں، عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کم سن بچہ تھے، جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی، عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کم سن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی (۴) اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے، چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں، عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا، ان انتظامات کے بعد آپؐ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی، دو خبر رساں بسبس اور عدی آگے روانہ کر دیئے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں، روحا، منصرف، ذات اجذال، معلاۃ، اثیل سے گذرتے ہوئے ۱۷ر رمضان کو بدر کے

(۱) کتاب الجہاد باب غزوۂ بدر ج ۲ ص ۸۴۔ (۲) کتاب المغازی غزوۂ بدر ج ۲ ص ۵۶۴۔ (۳) ابن سعد جزء مغازی ص ۶۔ (۴) منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۵ بہ روایت ابن عساکر، بدر۔

قریب پہنچے، خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں، آنحضرت ﷺ یہیں رک گئے اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا، رؤسائے قریش سب شریک تھے، ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا، رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس (بن مطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے (۱) عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلۂ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا "اب لڑنا ضرور نہیں" لیکن ابوجہل نے نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے، باقی فوج آگے بڑھی۔

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے، انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بہ خلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا، زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریتی میں دھنس دھنس جاتے تھے، حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے، وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے" حضرت حبابؓ نے کہا "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنویں بے کار کر دیئے جائیں" (۲) آپؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا، تائیدِ ایزدی اور حسنِ اتفاق سے مینھ برس گیا، جس سے گرد جم گئی اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں، اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ — اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے

(انفال۔۸: ۱۱)

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا، لیکن ساقیِ کوثر ﷺ کا فیض عام تھا، اس لئے دشمنوں کو بھی پانی

(۱) معارف ابن قتیبہ باب اسماء المطعمین من قریش فی غزاۃ بدر و سیرۃ ابن اسحق بہ روایت ابن ہشام غزوہ بدر ج ۱ ص ۴۰۶۔ (۲) ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۸۔

لینے کی عام اجازت تھی (۱)، یہ رات کا وقت تھا، تمام صحابہ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذاتِ نبویؐ) جو صبح تک بیدار اور مصروفِ دعا رہی، صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی، بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا (۲)۔

قریش جنگ کے لئے بے تاب تھے، تاہم کچھ نیک دل بھی تھے، جن کے دل خوں ریزی سے لرزتے تھے، ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردارِ فوج عتبہ سے جا کر کہا ''آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے'' عتبہ نے کہا کیوں کر؟۔

حکیم نے کہا ''قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خوں بہا ادا کر دیجئے'' عتبہ نیک نفس آدمی تھا، اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا، لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضرور تھا، حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے، ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا، عتبہ کا پیغام سن کر بولا ''ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا'' عتبہ کے فرزند حضرت ابوحذیفہؓ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ آئے تھے، اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو بلا کر کہا ''دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے'' عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر **واعمراہ واعمراہ** کا نعرہ مارنا شروع کیا، اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔

عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا میدانِ جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے، یہ کہہ کر مغفر مانگا، لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا، مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، صحابہ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔

اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں

(۱) ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶۔ (۲) منتخب کنز العمال غزوۂ بدر ج ۴ ص ۹۸ بہ روایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ۔

ہم رکاب تھیں، تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علم بردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی، دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارے سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے، لڑائی میں شور وغل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔

اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آکر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی، آنحضرت ﷺ ہمہ تن وفا تھے حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور حضرت حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد ﷺ کی مدد کو جارہے ہو، انہوں نے انکار کیا اور عدمِ شرکت کا وعدہ کیا، آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو صورتِ حال عرض کی، فرمایا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے(۱)۔

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ (آل عمران۔۳ : ۱۳)

جو لوگ باہم لڑے ان میں تمہارے لئے عبرت کا نشان ہے، ایک خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا منکرِ خدا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے "خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپؐ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا"۔

اس بے قراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی "حضور خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا" آخر روحانی تسکین کے ساتھ:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (قمر۔۵۴ : ۴۵)

فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔

---

(۱) صحیح مسلم (باب الوفاء بالعهد كتاب الجهاد والسير ج۲ ص ۹۸) "س"۔

پڑھتے ہوئے لبِ مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے (۱)۔

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، تاہم آپؐ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو۔

یہ معرکہ ایثار اور جاں بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا، دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدانِ جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ (۲) تلوار کھینچ کر نکلے، عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو نکلے، حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ (۳)

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا، آگے بڑھا، مِہجع حضرت عمر کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردارِ لشکر تھا، ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا، سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نام ور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے، عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے، حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں، پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمد! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں (۴) آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے، چونکہ (یہ لوگ خُود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے) (۵)،

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۵۶۴۔ (۲) استیعاب ذکر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ج ۲ ص ۴۰۴ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۱۹ھ۔ (۳) سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۸۸ مطبع محمد علی مصر) (۴) کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداؤد (کتاب الجہاد باب فی المبارزۃ ج ۲ ص ۳۶۱) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادرانِ عم زاد سے غرض ہے، تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ ''اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقامِ خون کا مطالبہ قریش سے ہے، انصار سے نہیں'' لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے، صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابوجہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا کاش مجھ کو فلاحوں (کاشت کاروں) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا، انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔ (۵) (ابن سعد غزوۂ بدر وبدایہ ونہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۷۳، مصر)۔

عتبہ نے پوچھا تم کون ہو، سب نے نام ونسب بتائے عتبہ نے کہا ''ہاں اب ہمارا جوڑ ہے''۔

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا، اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا، حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے، حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں دولتِ شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں تم نے شہادت پائی'' حضرت عبیدہؓ نے کہا آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں (۱)

ونسلمه حتی نصرّع حوله
ونذهل عن ابنائنا والحلائل

ہم محمد ﷺ کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بی بیوں سے بھلا نہ دیئے جائیں۔

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ ''میں ابوکرش ہوں'' حضرت زبیرؓ اس کے مقابلہ کو نکلے اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری، وہ زمین پر گرا اور مر گیا، برچھی اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ حضرت زبیر نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی لیکن دونوں سرے خم ہو گئے، یہ برچھی یادگار رہی، یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت ﷺ نے مانگ لی، پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی، پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس آئی (۲)۔

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا، اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی، چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑے تھے، وہ لڑتے لڑتے کر گئی تھی، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے، تو عبدالملک نے عروہ سے کہا تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہاں ہاں، عبدالملک نے پوچھا کیوں کر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے، عبدالملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا **بهن فلول من قراع الکتائب**، عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی، انہوں نے اس کی قیمت انکوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا (۳)۔

---

(۱) زرقانی ج ۱ ص ۴۸۴، ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابلِ الزام نہیں۔ (۲) صحیح بخاری غزوۂ بدر (ج ۲ ص ۵۷۰) میں پورا واقعہ منقول ہے۔ (۳) یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوۂ بدر (ج ۲ ص ۵۶۶) کے ذکر میں ہے۔

اب عام حملہ شروع ہوگیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے، لیکن ادھر سرورِ عالم ﷺ سر بہ سجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا، اس بنا پر انصار میں معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آجائے گا یا اس کو مٹا دیں گے، یا خود مٹ جائیں گے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعتاً مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے، ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا برادر زادہ! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ ''میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا، یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا'' میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں، میں نے دونوں کو اشارے سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے، بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا، دونوں جوان عفراء کے بیٹے تھے ''معوذؓ و معاذؓ'' (۱) ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذؓ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا، معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا، معاذؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے، لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہوگیا اور اب وہ آزاد تھے۔ (۲)

آنحضرت ﷺ نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ ''کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں، ان میں ایسے بھی لوگ ہیں، جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں'' ان لوگوں کے نام بھی آپؐ نے بتا دیئے تھے، ان میں ابوالبختری بھی تھا، مجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابوالبختری پر پڑی، مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں، ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا، ابوالبختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا ''نہیں'' ابوالبختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۶۸ بعض روایتوں میں ان دونوں نوجوانوں کا نام معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء ہے زرقانی میں اس پر تفصیل سے بحث ہے اور روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت بھی مذکور ہے، دیکھو زرقانی ج ۱ ص ۴۹۶ ''ض''۔ (۲) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔

کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا(۱)، یہ کہہ کر ابوالبختری یہ رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا، اور مارا گیا(۲)

لن یسلم ابن حرۃ زمیلہ — شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا، جب تک کہ مر نہ
حتیٰ یموت او یری سبیلہ — جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابوجہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت ﷺ کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگ بدر میں شریک تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے، بدر میں اس دشمنِ خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا، لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے، اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے، اتفاق یہ کہ حضرت بلالؓ نے دیکھ لیا، انصار کو خبر کر دی، دفعتاً لوگ ٹوٹ پڑے، انہوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا، لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، لیکن اس پر بھی قناعت نہ کی اور امیہ کی طرف بڑھے، انہوں نے امیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا تو یہ اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا، حضرت عبدالرحمٰنؓ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا، (۳)۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعۃ اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے، ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، بولے تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا ''ایک شخص کو اس کی قوم (۴) نے قتل کر دیا، تو یہ فخر کی کیا بات ہے''، ابوجہل نے ایک دفعہ ان

(۱) عیون الاثر ج ۱ ص ۲۵۸ مکتبہ قدسی ۱۳۵۶ھ۔ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۳۲۴۔ (۳) یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالہ (باب اذا وکل المسلم حربیاً الخ ج ۱ ص ۳۰۸) میں ہے، اس لئے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔ (۴) بخاری غزوہ بدر ج ۲ ص ۵۶۵۔

کو تھپڑ مارا تھا، انہوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا، ابوجہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے، حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت ﷺ کے قدموں پر ڈال دیا(۱)۔

مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالمِ اسباب میں جو کچھ ہے، صرف اسبابِ ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیوں کر فتح پائی، لیکن تائیدِ آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں، تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں، اول تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا، عتبہ سردارِ لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آکر واپس چلے گئے، پانی برسنے سے موقعِ جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے، یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ (آل عمران۔۳: ۱۳)　　وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت ﷺ نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں، مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے، بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں، ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائیدِ الٰہی ہے، پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی، قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولت مند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ تھے، قریش میں سو سوار تھے، مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے، مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے پورے تھے اور

(۱) زرقانی ج ۱ ص ۴۹۶ بروایت ابن اسحاق وحاکم۔

ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

بااین ہمہ خاتمۂ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی جن میں ۶ مہاجر اور باقی انصار تھے، لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی اور روٴسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے، قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے، باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے، ان میں حضرت عباسؓ عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) ابوالعاص (آنحضرت ﷺ کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپؐ اس کو زمین میں دفن کرا دیتے تھے (۱) لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا، تمام لاشیں آپؐ نے اس میں ڈلوا دیں، لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہٹائی جاوے، اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔ (۲)

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت ﷺ کی زوجۂ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں، ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے، ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔ (۳)

اسیرانِ جنگ دو دو چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے، جو حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو

---

(۱) روض الانف ج ۲ ص ۷۵ مطبعہ جمالیہ مصر ۱۹۱۴ء۔ (۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۴۷ برحاشیہ روض الانف۔ (۳) ایضاً ص ۷۷۔۷۸۔

روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ ہی کو واپس دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی، کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے (۱)۔

[قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت ﷺ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہؐ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ) تو گو نبی ہوں، لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑے گا۔ (۲)]

حضرت عباسؓ (کے بدن پر کرتا نہ تھا، لیکن ان) کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا، اپنا کرتا منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتا عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا (۳)۔

عام روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں، لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے، آنحضرت ﷺ نے صدیقِ اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری:

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال۔۸ : ۶۸)

اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا، اس پر عذاب نازل ہوتا۔

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتابِ ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے، لیکن سببِ عتاب کے بیان میں اختلاف ہے، ترمذی میں جو روایت ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۳۳۸ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۳۴۴ (۳) صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۴۲۲: باب الکسوۃ للاساری۔

مالِ غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے، عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ غنیمت میں مصروف ہو گئے، اس پر عتاب آیا، لیکن چونکہ اسکے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم آیا کہ مالِ غنیمت جو ہاتھ آ چکا حلال ہے۔

قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں:

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (انفال۔۸ : ۶۹) تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا اور وہ مالِ غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مالِ غنیمت کے لوٹنے پر تھا، صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی، تو آپ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا'' ابکی الذی عرض علی اصحابک من اخذھم الفداء یعنی تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا، اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا، اس پر میں رو رہا ہوں'' عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیرانِ جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا، چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (انفال۔۸ : ۶۷) کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خوں ریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدانِ جنگ میں جب تک کافی خوں ریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں، اس سے یہ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خوں ریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لئے گئے، تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جا سکتے ہیں۔

بہر حال اسیرانِ جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیئے گئے، ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں (۱) تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا (۲)۔

انصار نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن آنحضرت ﷺ نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا (۳) اور

(۱) مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۴۷۔ (۲) طبقات ابن سعد جزء مغازی قسم اول ص ۱۴۔ (۳) بخاری ص ۵۷۲ ج ۲ کتاب المغازی غزوۂ بدر۔

ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا، فدیہ کی عام مقدار ۴،۴ ہزار درہم تھی، لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباسؓ دولت مند تھے، اس لئے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی، اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے، (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے، لوگوں نے ان کی گرہ کھولی تو آپ نے آرام فرمایا)۔

آنحضرت ﷺ کے داماد ابوالعاص بھی اسیرانِ جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی، آنحضرت ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا، حضرت زینبؓ نے زرِ فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آ گیا، آپ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو، سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا (۱)

(ابوالعاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا، ابوالعاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے سروسامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے، واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انہوں نے پناہ دی، آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا اسباب واپس کر دو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا، اب یہ وار ایسا نہ تھا، جو خالی جاتا، ابوالعاص مکہ آئے اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں تا کہ یہ نہ کہو کہ ابوالعاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا) (۲)۔

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا، لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ

---

(۱) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۳۴۸ و ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی فداء الاسیر بالمال ج ۲ ص ۳۶۷۔ (۲) (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۳۵۱)۔

کوئی شخص رونے نہ پائے، اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے، اس کا دل امنڈا آتا تھا، لیکن قومی عزت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا، اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہوگئی، میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے، جی کھول کر رولوں تو تسکین ہو جائے، آدمی نے آکر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے، اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

اتبکی ان یضل لھا بعیر	اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے
ویمنعھا من النوم السھود	اور اس کو نیند نہیں آتی ، اونٹ پر مت
فلا تبکی علی بکر و لکن علی	رو ، بدر پر آنسو بہا ، جہاں قسمت نے
بدر تقاصرت الجدود	کمی کی ، تجھ کو رونا ہے تو عقیل پر رو اور
فبکی ان بکیت علی عقیل	حارث پر رو جو شیروں کا شیر تھا ۔
وبکی حارثا اسد الاسود	

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولینِ بدر کا ماتم کر رہے تھے، صفوان نے کہا "خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں"، عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد ﷺ کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے، صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا، حضرت عمرؓ نے اس کے تیور دیکھ لئے، گلا دبائے اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے آپؐ نے فرمایا عمر! چھوڑ دو، عمیر قریب آجاؤ، پوچھا کس ارادے سے آئے؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں، فرمایا کیوں نہیں؟ تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر یہ کی بات سن کر سناٹے میں آگیا، بے اختیار ہو کر بولا محمد! ﷺ بے شک تم پیغمبر ہو، بہ خدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی، قریش جو آنحضرت ﷺ کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے، انہوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے، جہاں کا ہر ذرّہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اسی شدت سے وہ اب دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے، یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمعِ کثیر کو

اس روشنی سے منور کر دیا(۱)۔

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں: اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورہ (انفال) بدر کے احسانات ونعم کی تفصیل اور بعض مسائلِ متعلقۂ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے، واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں:

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ. كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ. يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ. وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ. لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ. اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ. وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ

(۱) مومن وہ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز بہ پابندی پڑھتے ہیں اور خدا نے جو ان کو روزی دی ہے اس سے راہِ خدا میں بھی کچھ دیتے ہیں، یہ ہیں سچے مومن، ان کے لئے خدا کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے، جس طرح اے پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (بدر تک) نکال لایا، حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے، گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب خدا تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے، تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے اور باطل کو مٹائے گو گنہ گار اس سے رنجیدہ ہوں، یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمہاری سنی (اور کہا) میں تمہاری لگاتار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا، خدا نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینانِ قلب کے لئے کیا اور فتح تو

---

(۱) یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیرؓ مذکور ہیں، جلد ۳ ص ۱۳۵۴۔

وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى
قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ . اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى
الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ
قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ
الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ . ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابَ النَّارِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ . وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ
فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ ۝ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ . فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا
رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ
الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ .
ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ . اِنْ
تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ
شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ .

(انفال ـ ۸ : ۲ تا ۱۹)

صرف خدا کے پاس ہے، خدا غالب و دانا ہے، یاد کرو جب تمہارے چین کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے، یاد کرو جب خدا فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا، کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دینے والا ہے، یہ ہے عذاب، اس کا مزہ چکھو، کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے، مسلمانو! جب میدانِ جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس کے کہ لڑنے کے لئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے، جو کوئی پشت پھیرے وہ خدا کا غضب لائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور کیا برا ٹھکانا ہے، مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا، لیکن خدا نے مارا اور اے محمدؐ! تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا تا کہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے، خدا دانا اور بینا ہے اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے، اگر فتح چاہتے تھے تو فتح آچکی، اب اگر رک جاؤ تو بہتر ہے اور تم پھر مخالفت پر آمادہ ہوگے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں، گو وہ کتنی ہی کثیر ہو اور خدا مومنوں کے ساتھ ہے۔

(۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ
خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى

(۲) اور جان لو کہ جو مالِ غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہلِ قرابت کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے، اگر خدا پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق

الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ . اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ . اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِىْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۗ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ . وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِىْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِىْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ . يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ . وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ.

(انفال۔۸ : ۴۱ تا ۴۷)

کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) خدا نے اپنے بندے پر جو فتح اتاری اس کو مان چکے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا، اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا، لیکن (خدا نے یہ اس لئے کر دیا) تا کہ جو ہونے والا تھا خدا اس کو کر دے تا کہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بے شک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، یاد کرو جب خدا تم کو رویا میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑے پڑتے، لیکن خدا نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں خدا ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تا کہ جو ہونے والا ہے خدا اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف تمام معاملے پھرتے ہیں، مسلمانو! جب کسی دستۂ فوج سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو اکثر یاد کیا کرو تا کہ کامیاب ہو، اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، مستقل رہو، خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور خدا ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳) مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ وَ اللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ . لَوْ لَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ. فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ . یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ . وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ .

(انفال۔۸ : ۶۷ تا ۷۱)

(۳) پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں تا آنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور خدا آخرت چاہتا ہے، خدا دانا اور توانا ہے، اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لے لیا، اس پر دردناک عذاب پہنچتا، اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا، کھاؤ وہ حلال طیب ہے اور خدا سے ڈرا کرو، خدا آمرزگار اور مہربان ہے۔ اے پیغمبر تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ خدا اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ خدا کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، اسی لئے تو خدا نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا، خدا دانا اور باخبر ہے۔

خدا نے اسی احسان کو احد کے موقع پر یاد دلایا ہے :

وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ . (آل عمران۔۳ : ۱۲۳)

یقیناً خدا نے تمہاری بدر میں مدد کی، جب تم کمزور تھے، تو خدا سے ڈرو تا کہ تم شکر گذار بن جاؤ۔

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے، مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا اندازِ بیان مقدمۂ دیوانی یا فوج داری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے، میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں، لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعۂ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اس لئے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصلِ مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے، سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہئے کہ (ہماری تحقیقات کے رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پر حذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے، غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثنا میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے، قریش

نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں، آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہئے، جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصالِ بحث میں اصولِ موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

۲۔ کتبِ حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرقِ مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپؐ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر سعدؓ یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپؐ حکم دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں (۱)

یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہؓ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۔ اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔

(انفال۔۸ : ۵)

عموماً اربابِ سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ ”جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے“۔ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے، ان واقعات کے بعد اب مرکزِ بحث یہ ہے کہ ”یہ واقعات

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۳۰۲ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۵۔

کہاں پیش آئے'' ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپؐ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں، اس وقت آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے، (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہئے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ . يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ. وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ .

(انفال۔۸ : ۵ تا ۷)

جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

۱۔ ترکیب نحوی کے رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے حالیہ ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپؐ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ ﷺ آگے بڑھے، کیوں کہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہئے۔

۲۔ آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کہ ''دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے''۔ اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہئے، جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال

ہوسکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے، جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

۳۔ سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیتِ مذکورۂ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحبِ شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ. (انفال۔۸: ۷)

اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں، جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

۴۔ اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جاں باز مہاجر وانصار ساتھ ہیں ان میں فاتحِ خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ سید الشہداء بھی ہیں، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے، باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہؓ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لئے جاتا ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ. يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (انفال۔۸: ۵، ۶)

اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلوتہی کس بنا پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بہ قول اربابِ سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور

منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں ۔

۵۔　قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے، آیت یہ ہے:

لَايَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً (نساء۔۴: ۹۵)	بجز معذوروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہوسکتے ، خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے ۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے ، دونوں برابر نہیں ہو سکتے ، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ کا جملہ نہ تھا ، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا ، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا ''غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ'' یعنی ''معذوروں کے سوا'' یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

۶۔　کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ، ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے :

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (انفال۔۸ : ۴۷)	اور (ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمایشی اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے ؟ اس میں اظہارِ شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا ؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے ، جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمایش اور اسلام کی ترقی

کا انسداد تھا اس لئے خدا نے اس کو غرور و نمایش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیث نبویؐ کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے، لیکن حضرت کعبؓ بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے:

عن عبداللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللّٰہ ﷺ فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنھا ، انما خرج النبی ﷺ یرید عیر قریش حتیٰ جمع اللہ بینہ وبینھم علی غیر میعاد (۱)

کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا کیوں کہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے:

۱. عن انس ان رسول اللہ ﷺ شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لا خضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا۔

۱۔ انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپؐ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپؐ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے آپؐ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر حضرت سعدؓ بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے، خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ ﷺ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کو شرکتِ جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

۲. ووردت علیھم روایا قریش وفیھم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ یسئلونہ عن ابی سفیان

۲۔ اور (پہلے) قریش کا ہراول آ کر اترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر

(۱) بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ بدر ج ۲ ص ۵۶۴۔

و اصحابه فيقول مالي علم بابي سفيان ولكن هذا ابو جهل و عتبة و شيبة و امية بن خلف فاذا قال ذلك ضربوه فقال نعم انا اخبركم هذا ابوسفيان فاذا تركوه فسئالوه فقال مالي بابي سفيان علم و لكن هذا ابوجهل و عتبة و شيبة و امية بن خلف في الناس فاذا قال هذا ايضا ضربوه و رسول الله ﷺ قائم يصلي فلما راى ذلك انصرف قال والذي نفسي بيده لتضربوه اذا صدقكم و تتركوه اذا كذبكم.

نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آرہے ہیں جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کو بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آرہے ہیں، لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

(صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر غزوۂ بدر ج ۲ ص ۸۴)

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپؐ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ محققاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا، اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتبِ سیر میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ اربابِ سیر کے مطابق واقع یہ ہونا چاہئے کہ انصار معاہدہ اور معمولِ سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے، آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بہ وضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔

اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے، اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ ''جب مشرکینِ مکہ کی آمد

کی خبر معلوم ہوئی'' چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے ساتھ امام احمدؒ بن حنبل نے مسند (۱) میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف (۲) میں، ابن جریر نے تاریخ (۳) میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو ''صحیح'' کہا ہے اور اس کے راوی معرکہ بدر کے ہیرو اسد اللہ علیؓ بن ابی طالب ہیں:۔

عن علی قال لما قدمنا المدینة اصبنا من ثمارها فاجتوینا ها و اصابنا بها وعک و کان النبی ﷺ یتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار رسول اللہ ﷺ الی بدر و بدر بئر فسبقنا المشرکین الیها

(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافقِ مزاج تھے، اس لئے ہم لوگ بیمار ہوگئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آرہے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے، بدر ایک کنویں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

(اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکینِ مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ ﷺ نکلے تھے اور بدر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)

ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي کے طور پر واقعاتِ ذیل پر لحاظ کرنا چاہئے:

(۱) آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، اربابِ سیر اس امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپؐ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بنا پر آپؐ نے انصار کو مخاطب کیا، کیوں کہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

---

(۱) جلد اول ص ۱۱۷۔ (۲) منتخب کنز العمال غزوۂ بدر ج ۴ ص ۹۷ برحاشیہ مسند احمد بن حنبل۔ (۳) جلد ۳ صفحہ ۱۲۸۹۔

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا، اس بنا پر اگر کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپؐ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے :

۱۔ قریش نے عبداللہ بن ابیؓ کو خط لکھا کہ ''محمد اور ان کے رفقاء کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آ کر تم کو بھی برباد کر دیں گے'' (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گذر چکا)

۲۔ ابو جہل نے سعد بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا۔

۳۔ کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ ہجری میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے اونٹ لوٹ لئے۔

۴۔ اس کے بعد ہی رجب ۲ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہؓ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

۵۔ عبداللہؓ بن جحش نے (آنحضرت ﷺ کی مرضی کے خلاف) قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کئے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیشِ نظر رکھو، پھر یہ خیال کرو کہ ان کا جوشِ انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبداللہؓ بن ابی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آ کر تم کو اور محمدؐ دونوں کو فنا کر دیں گے، کرز فہری مدینہ پر چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن جحش نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لئے، ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے، جب آنحضرت ﷺ ان کے قافلہ کو جس میں مکہ کی کل کائنات تھی، لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں، تب

مجبوراً ان کو مدافعت کے لئے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو ان کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا، رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں، واپس چلنا چاہئے، کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ نبوت کے موافق ہے؟۔

(۴) ارباب سیر عموماً لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروانِ تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی، کیوں کہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ و جہاد نہیں ہے، بلکہ صرف تحصیلِ غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مال کی حاجت تھی وہ گئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیانِ قوم اور سرِ لشکر تھے، سب گئے، زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے، لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دوگنی تگنی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جاں نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و مقدادؓ تھے اور انصار میں حضرت سعد بن عبادہؓ (۱) تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جا سکے تھے، اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا، اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

(۵) عام اربابِ سیر بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے، صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے، جس کا جی چاہے جائے، جس کا جی چاہے نہ جائے، طبری میں ہے:

قالوا لما سمع رسول اللہ ﷺ بابی سفیان	لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے
مقبلا من الشام ندب المسلمین الیھم وقال	ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا
ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا	کہ یہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے، چلو شاید

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوۂ بدر ج ۲ ص ۸۴ و صحیح بخاری غزوۂ بدر ج ۲ ص ۵۶۴۔

لعل اللّٰہ ان ینفلکموھا فانتدب الناس فخف بعضھم وثقل بعضھم و ذلک انھم لم یظنوا ان رسول اللّٰہ یلقی حربا (ج۳ص۱۲۹۳)

خدا تم کو اس میں سے مالِ غنیمت دلوادے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی، کیوں کہ وہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔

لیکن یہ واقعات صریح قرآنی آیات کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدمِ ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جارہے ہیں:

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَكٰرِهُوْنَ یُجَادِلُوْنَكَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ كَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ (انفال۔۸:۵،۶)

اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہوگیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔

(۶) تمام کتبِ احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیر اَبی غبتہ میں) آپؐ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیئے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا، جو ایک فریضۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے، اس لئے نابالغ لوگ واپس کردیئے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں۔

(۷) حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب (۱) میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہؓ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو، اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو، سعدؓ نے کہا ''حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا، لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے، میں اس کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں''۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، سعدؓ شریکِ جنگ ہوکر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولتِ شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

---

(۱) استیعاب تذکرۂ سعدؓ بن خیثمہ ج ۲ ص ۵۶۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۱۹ھ، اصابہ ج ۲ ص ۲۵، اور طبقات ذکر خیثمہ ج ۶ ص ۲۰۰ میں یہ واقعہ باختلافِ الفاظ منقول ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب: عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامۂ کارزار قائم ہو جاتا تھا، دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا، عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر خاندان میں وراثتاً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے، داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں اسی بنا پر ہوئیں، عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، حضرت عبداللہ بن جحش کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا، حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا، جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بہ تصریح بیان کیا ہے:

وكان الذی هاج وقعة بدر و سائر الحروب التی كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركی قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد (۱) بن عبدالله التميمی عمرو بن الحضرمی (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۲۸۴)	جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے، عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے، جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔

ایک عام غلطی جس نے واقعہ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی، حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

ان ابا سفيان بن حرب اقبل من الشام فی قريب من سبعين راكبامن قبائل قريش فذكروا لرسول الله ﷺ واصحابه وقد كانت الحرب بينهم فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمی	ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آ رہا تھا، جو کل کے کل قریشی تھے، آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سے اس کا تذکرہ ہوا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا، مارے جا چکے تھے اور

(۱) عبداللہؓ بن جحش جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا، حضرت حمزہؓ کے بھانجے اور آنحضرت ﷺ کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبداللہ بن جحش جلد ۳ قسم اول ص ۶۴ و واقد بن عبداللہ جلد ۳ قسم اول ص ۲۸۴۔

فی نـاس بـنـخـلـة و اسـرت اسـاری من قریش وكـانـت تـلـك الـوقعة هاجت الحرب .... بـيـن رسـول الـلّـه ﷺ و بين قريش و اول ما اصاب به بعضهم بعضا من الحرب و ذلك قبل مخرج ابی سفیان و اصحابه الی الشام.

(طبری ج ۳ ص ۱۲۸۵)

کچھ قید بھی ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔اور اسی واقعہ نے آنحضرت ﷺ اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہی سب سے پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگیِ شام سے پہلے وقوع میں آ چکی تھی۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا، اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی، غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسیِ شام کے بعد واقع ہوا ہے۔

اصلیتِ واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفانِ جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے، اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آ سکتی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے، حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے، وہ عمر میں آنحضرت ﷺ سے پانچ برس بڑے تھے اور گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی، تاہم فتحِ مکہ تک ایمان نہیں لائے، وہ رؤسائے قریش میں تھے، حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے (۱) وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے، ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے، مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدرِ مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے، انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا:

يـا ابـا الـولـيـد هـل لـك ان تذهب بشرف هذا الـيـوم مـا بـقـيـت قـال افـعـل ماذا؟ قلت انكم لا تـطـلـبـون من محمد الا دم ابن الحضرمی وهو حليفك فتحمل ديته فترجع بالناس (۲)

اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیوں کر؟ میں نے کہا تم (یعنی قریش) محمدؐ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا، اس لئے تم اس کا خوں بہا ادا کر دو، کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا،

---

(۱) اصابہ تذکرہ حکیمؓ بن حزام ج ۱ ص ۳۴۹۔ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۳۱۴ (وسیرۃ ابن ہشام بمعناہ ذکر غزوۂ بدر) ج ۱ ص ۳۸۰ ''س''۔

خون کا بدلہ سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو، عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا ۔(۱)

واعمراہ واعمراہ — ہائے عمرو (حضرمی) ہائے عمرو!

آغازِ جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے، عتبہ و ابوجہل جو سردارانِ قریش تھے کفر پر تادمِ مرگ قائم رہے، اگر اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہئے کہ اوروں نے جو اس کے سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے، اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا، وشتّان بینهما ۔

ایک ضروری نکتہ: گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا، تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام اربابِ سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصولِ جنگ کے موافق، اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں، ان کا قول نقل کیا ہے:

ولم یکن رسول اللہ ﷺ یرید غزوۃ الا ورّی بغیرھا (۲) — اور آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔

''توریہ'' کے معنی شارحینِ بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ ''آپؐ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے'' (۳) گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں، تاہم واقعات کے استقصاء سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جنگِ بدر میں سعدؓ بن خیثمہ کو پہلے ہی یہ معلوم

(۱) پوری تفصیل طبری ج ۳ صفحہ ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۶ میں ہے۔ (۲) بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ تبوک ج ۲ ص ۶۳۴۔

(۳) فتح الباری باب غزوۂ تبوک ج ۸ ص ۸۷ ''ک، ص''۔

ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بہ خلاف اس کے صحیح بخاری میں ان ہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا، بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کئے اور جو قیاس مذاق عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج: (بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالت پر گونا گوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدمِ اولین تھا، قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا، فنا ہو گئے، عتبہ اور ابو جہل کی موت نے قریش کی ریاستِ عامہ کا تاج ابو سفیان کے سر پر رکھا، جس سے دولت اموی کا آغاز ہوا، لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا، لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا، گو تمام عمر منافق رہا اور اسی حالت میں جان دی، قبائلِ عرب جو سلسلۂ واقعات کا رخ دیکھتے تھے، اگرچہ رام نہیں ہوئے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا، یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یک سو رہیں گے، لیکن اس فتحِ نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے، چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا، بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا اور مقتولینِ بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطرب تھا، چنانچہ سویق کا واقعہ اور احد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا۔)

غزوۂ سویق ذی الحجہ ۲ ہجری: ابو سفیان اب قریش کا رئیس تھا اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا، اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے گا، نہ غسلِ جنابت کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا، یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے اس لئے

پہلے حیّ بن اخطب کے پاس گیا، لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا، مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا، وہ یہودِ بنو نضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا، اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوش گوار کھانے کھلائے، شراب پلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے، صبح کو ابوسفیان عُریض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے، ایک انصاری کو جن کا نام سعدؓ بن عمرو تھا قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے، ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ؐ نے تعاقب کیا، ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا، گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا، جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لئے یہ واقعہ غزوہ سُویق کے نام سے مشہور ہے (۱)۔

حضرت فاطمہ زہرؓا کی شادی ذی الحجہ ۲ ہجری: حضرت فاطمہؓ جو آنحضرت ﷺ کی صاحب زادیوں میں سب سے کم سن تھیں، اب ان کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے، ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی، آپ ؐ نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہوگا، پھر حضرت عمرؓ نے جرأت کی، ان کو بھی آپ ؐ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے (۲) لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں، حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں، لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال حضرت علیؓ نے جب درخواست کی تو آپ ؐ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہارِ رضا تھا، آپ ؐ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے، بولے کچھ نہیں، آپ ؐ نے فرمایا "اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے، آپ ؐ نے فرمایا بس وہ کافی ہے۔

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی، اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپئے (۳)، زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۳۶۷۔ (۲) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۱ "ک، ص" (۳) [غلطی سے پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سوا روپے چھپ گیا ہے، اس کی تصحیح کر لی جائے] "س"۔

اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی، حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہؓ زہرا کے نذر کیا، حضرت علیؓ اب تک آنحضرت ﷺ ہی کے پاس رہتے تھے، شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں، حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ان ہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے، آپؐ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے، حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپؐ کا ہے، خدا کی قسم میرا جو مکان آپؐ لے لیتے ہیں، مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے، غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا، حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔(۱) شہنشاہِ کونینؐ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا، جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے(۲)۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے(۳)۔

واقعات متفرقہ ۲ ہجری: (مورخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضانِ مبارک کے روزے فرض ہوئے(۴)

صدقۂ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا، پہلے آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا(۵)۔

عید الفطر کی نماز با جماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔(۶)

اربابِ سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہئے تھا، لیکن اتصال اور تسلسلِ واقعہ کی بنا پر وہ آئندہ مذکور ہوگا۔)

---

(۱) اصابہ ج ۸ قسم اول ص ۱۵۸ (۲) ایضاً ص ۱۵۹ (۳) یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد ذکر فاطمہؓ ج ۸ ص ۱۵ اور اصابہ ذکر فاطمہؓ ج ۸ قسم اول ص ۱۵۷ سے ماخوذ ہے (۴) تاریخ طبری ج ۳ واقعہ ۲ ہجری ص ۱۲۸۱ (۵) ایضاً (۶) ایضاً ''ک، ص''

۳ ہجری
غزوۂ احد (۱)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲)

(آل عمران۔۳ : ۱۳۹)

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سیکڑوں برس تک ختم نہیں ہوسکتا تھا، طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض مؤبّد جانتا تھا جس کے ادا کیے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی، بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج وافسر تھے، اس بنا پر تمام مکہ جوشِ انتقام سے لبریز تھا۔

قریش کا کاروانِ تجارت جو جنگِ بدر کے زمانے میں نفعِ کثیر کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا، اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کردیا گیا تھا، لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

قریش کو کشتگانِ بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا، چند سردارانِ قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز واقارب جنگِ بدر میں قتل ہوچکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد ﷺ نے ہماری قوم کا خاتمہ کردیا، اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مالِ تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے، وہ اس کام میں صرف کیا جائے، یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کرلی گئی تھی، لیکن قریش کو اب مسلمانوں

(۱) مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ (۲) صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ احد میں نازل ہوئی) ج۲ ص ۵۷۸۔

کے قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا، وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے، اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے، عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا، قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا، قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائلِ قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی، بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگِ بدر میں قتل ہو چکی تھی، اس لئے وہ خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں اور انہوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی، غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں (۱)

۱۔	ہند	عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں
۲۔	ام حکیم	عکرمہ (فرزندِ ابو جہل) کی بیوی
۳۔	فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالدؓ کی بہن
۴۔	برزۃ	مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا، اس کی بیٹی
۵۔	ریطہ	عمرو بن العاص کی زوجہ
۶۔	خناس	حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں

حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا، جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگذاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۶) زرقانی (ج ۲ ص ۳۰) نے ان چھ خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد اور عمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے، ان میں خناس اور عمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہو گئیں، خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں، (زرقانی علی المواہب) "س"۔

حضرت عباسؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا گو اسلام لا چکے تھے، لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، انہوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔

آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے پانچویں شوال ۳ ہجری کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لئے بھیجے، انہوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔

آپؐ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں، انہوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے، حضرت سعدؓ بن عبادۃ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجدِ نبویؐ کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا، مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے، عبداللہ بن ابی بن سلول جواب تک کبھی شریکِ مشورہ نہیں کیا گیا تھا (۱) اس نے بھی یہی رائے دی، لیکن ان نوخیز صحابہ (۲) نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے، آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے، اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو خلافِ مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہِ احد پر پڑاؤ ڈالا، آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن ابی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ ''محمد ﷺ نے میری رائے نہ مانی''، آنحضرت ﷺ کے ساتھ اب صرف ۷۰۰ صحابہ رہ گئے، ان میں ایک سو زرہ پوش تھے، مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کم سن تھے، واپس کر دیئے گئے، ان میں حضرت زید بن ثابت، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عرابہؓ اوسی بھی تھے، لیکن جاں نثاری کا یہ

---

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۹ مطبوعہ یورپ) ''س''۔ (۲) (زرقانی ج ۲ ص ۲۵) ''س''۔

ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب حضرت رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے (۱) سمرۃؓ ایک نوجوان، جوان کے ہم سن تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافعؓ کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں، اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہئے، دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرۃؓ نے رافعؓ کو زمین پر دے مارا اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت ﷺ نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے (۲) پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ "گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں" (۳) حضرت عبداللہؓ بن جبیر ان تیراندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیراندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علم بردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبلِ جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقامِ خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

نحن بنات طارق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں۔
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں۔
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی (۴)۔

(۱) طبری جلد ۳ ص ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے، لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیراندازی میں کمال رکھتے تھے، حضور ﷺ کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی، ابن ہشام ذکر غزوہ احد ج ۲ ص ۶۸ و زرقانی ج ۲ ص ۲۹ و بدایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵)"س"۔ (۲) ایضاً ص ۱۳۹۴۔ (۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۶۸۔ (۴) ایضاً ص ۶۹۔

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا، چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آ کر پکارا، ''مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں'' انصار نے کہا ''ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے''۔(۱)

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا ''کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے؟ کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے''(۲) حضرت علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر کہا ''میں ہوں''(۳) یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی، طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

ان علی اھل اللواء حقا	علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے، یا
ان تخضب الصعدۃ او تندقا	وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے ۔

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ ''میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں''(۴)۔

اب عام جنگ شروع ہوگئی، حضرت حمزہؓ حضرت علیؓ، حضرت ابو دجانہؓ، فوجوں کے دَل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں، حضرت ابو دجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت ﷺ نے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا، کون اس کا حق ادا کرتا ہے، اس سعادت کے لئے دفعتاً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہؓ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے''(۵)، حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے، بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۳۹۹ و ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹۔ (۲) یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں (۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۷۳۔ (۴) ابن ہشام ج ۲ ص ۷۴۔ (۵) ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹۔

آزمائی جائے۔

حضرت حمزہؓ دودستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے، صفیں کی صفیں صاف ہوجاتی تھیں، اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آگیا، پکارے کہ ''او ختانۃ النساء کے بچے کہاں جاتا ہے؟'' (۱) یہ کہہ کر تلوار ماری، وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کردے تو آزاد کردیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا، حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا، جو ناف میں لگا اور پار ہوگیا، حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کرگئی۔ (۲)

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہوجاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جاں باز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا، ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا، جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا، علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبالیا، اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ ''میں نے اپنا فرض ادا کردیا'' (۳)۔ علم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون (عمرۃ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا، یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے پانوں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا لیکن اس کے بیٹے حضرت حنظلہؓ اسلام لاچکے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، لیکن رحمت عالم ﷺ نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے، حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کردے، دفعتاً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کردیا، تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا، علم برداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابودجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، بہادر

---

(۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۷۰۔ (۲) صحیح بخاری باب قتل حمزہؓ ج ۲ ص ۵۸۳۔ (۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۷۵۔ ۷۶ وطبری (ج ۳ ص ۱۴۰۱) ''س''۔

نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیرانداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا، لیکن وہ رک نہ سکے(۱) تیراندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہؓ بن جبیر چند جاں بازوں کے ساتھ جم کر لڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے، اب راستہ صاف تھا، خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا، لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں، بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جو آنحضرت ﷺ سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی، اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں، لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا ''مسلمانو! خدا تم کو بخش دے''(۲) رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں، جن میں حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابودجانہؓ، حضرت طلحہؓ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے، صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی، لیکن جاں بازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا، آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی، حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے، لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ ﷺ) کا پتہ نہ تھا، حضرت انسؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس

---

(۱) صحیح بخاری غزوۂ احد ج ۲ ص ۵۷۹۔ (۲) صحیح بخاری غزوۂ احد ج ۲ ص ۵۸۱۔

ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے (۱) پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے "اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ ﷺ نے تو شہادت پائی" ابن نضر نے کہا "ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے" یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی، لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی (۸۰) سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر پہچانا (۲)۔

جاں نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے، لیکن نگاہیں سرور عالم ﷺ کو ڈھونڈتی تھیں، سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں، حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں"۔ یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے، کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" زیادؓ بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جاں بازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں (۳) حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہان نیاز مندے — کہ بہ وقتِ جانِ سپردن بسرش رسیدہ باشی

(ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ "یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا" آپ ﷺ نے فرمایا "جنت میں" اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا) (۴)۔

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری، اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپؐ کو دائرہ

(۱) یہ عام ارباب سیر کی روایت ہے، صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۷۹ میں یہ واقعہ مذکور ہے، لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں۔
(۲) (صحیح بخاری غزوۂ احد ج ۲ صفحہ ۵۷۹ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۳۸۔ باب ثبوت الجنة للشهيد) "س"۔
(۳) صحیح مسلم غزوۂ احد میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں ج ۲ ص ۹۰۔
(۴) [بخاری غزوۂ احد ج ۲ ص ۵۷۹] "س"

میں لے لیا، ابودجانہؓ جھک کر سپر بن گئے اب جو تیر آتے تھے، ان کی پیٹھ پر آتے تھے، حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، بے درد، رحمت عالم ﷺ پر تیر برسا رہے تھے اور آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے :

رب اغفر قومی فانهم لا یعلمون (۱) اے خدا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں

حضرت ابوطلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے، مشہور قدر انداز تھے، انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں، انہوں نے سپر سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپؐ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپؐ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ ﷺ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، یہ میرا سینہ سامنے ہے (۲) حضرت سعدؓ بن وقاص بھی مشہور تیر انداز تھے اور اس وقت آپؐ کے رکاب میں حاضر تھے، آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا ''تم پر میرے ماں باپ قربان تیر مارتے جاؤ'' (۳)۔

اسی حالت میں آپؐ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا ''وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے''۔ بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے اور یہ آیت اتری:

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ (آل عمران۔۳:۱۲۸) تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں ۔

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے ۔

رسول اللہ ﷺ ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے، ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا، لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا (۴)۔

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے، حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے، جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا (۵)۔

---

(۱) (صحیح مسلم غزوۂ احد ج۲ ص۹۰) (۲) صحیح بخاری غزوۂ احد ج۲ ص۵۸۱۔ (۳) صحیح بخاری غزوۂ احد ج۲ ص۵۸۰۔

(۴) طبری ج۳ ص۱۴۱۰ و ۱۴۱۱ (۵) صحیح بخاری غزوۂ احد (ج۲ ص۵۸۴)۔

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ "یہاں محمد ﷺ ہیں"؟ آپؐ نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے، ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے "او دشمنِ خدا! ہم سب زندہ ہیں"۔

ابوسفیان نے کہا:

اعل هبل (۱) اے ہبل تو اونچا رہ۔

صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ کے حکم سے کہا:

اللّٰہ اعلیٰ و اجلّ خدا اونچا اور بڑا ہے۔

ابوسفیان نے کہا:

لنا العزیٰ ولا عزی لکم ہمارے پاس عزیٰ ہے (۲) تمہارے پاس نہیں۔

صحابہؓ نے کہا:

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے، فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا" (۳)

آنحضرت ﷺ نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمانؓ اور حضرت ثابتؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر احد کی طرف بڑھے، حضرت ثابتؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت یمانؓ کو مسلمان ہجومِ عام میں پہچان نہ سکے، ان پر تلواریں برس پڑیں، ان کے صاحب زادے حضرت حذیفہؓ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور پکارا کیا کہ میرے باپ ہیں، لیکن ہنگامہ میں کون سنتا تھا، حذیفہؓ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! خدا تمہارے اس گناہ کو بخش دے" (۴) آنحضرت ﷺ نے حضرت یمانؓ کا خوں بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا، لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا، ابن ہشام میں یہ واقعہ

---

(۱) بت کا نام۔ (۲) بت کا نام ہے، لفظی معنی عزت کے ہیں۔ (۳) یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ احد کے ذکر میں ہے، ج ۲ ص ۵۷۸ و مابعد۔ (۴) ابن ہشام ج ۲ ص ۸۱۔

تفصیل مذکور ہے، صحیح بخاری میں بھی ہے، لیکن مختصر ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، ان کے ناک کان کاٹ لئے، ہند (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا، حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی، لیکن گلے سے اتر نہ سکا، اس لئے اگل دینا پڑا، تاریخوں میں ہند کا لقب جوجگر خوار لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر لکھا جاتا ہے، ہند فتحِ مکہ میں ایمان لائی، لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلامؓ نے بھی شرکت کی، حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ، جو حضرت انس کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ "میں نے حضرت عائشہؓ اور امِ سلیمؓ کو دیکھا کہ پائینچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں (۱)" ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امِ سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابوسعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی (۲)۔

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے، حضرت امِ عمارہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں، کفار جب آپؐ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں، ابن قمیہ جب دڑاتا ہوا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا، تو حضرت امِ عمارہؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا، انہوں نے بھی تلوار ماری، لیکن وہ دہری زرہ پہنے ہوئے تھا، اس لئے کارگر نہ ہوئی (۳)

حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں، آنحضرت ﷺ نے ان کے صاحب زادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں، حضرت زبیرؓ نے آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا، بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، لیکن اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر چپ ہو رہیں

(۱) (صفحہ ۵۸۱ کتاب المغازی غزوۂ احد) (۲) صحیح بخاری صفحہ ۵۸۲ ذکرِ امِ سلیطؓ (۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۷۸ و ۸۴ مطبع محمد علی، مصر)

اور مغفرت کی دعا مانگی ۔(۱)

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ ، بھائی ، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے ، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی ، لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں ، اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی (۲)۔

کل مصیبة بعدک جلل — تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

اے شہہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم — میں بھی اور باپ بھی ، شوہر بھی ، برادر بھی فدا

(مسلمانوں کی طرف ستر آدمی مارے گئے ، جن میں زیادہ تر انصار تھے ، لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہوسکتی ، حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ ایک صحابی تھے کہ ان کا پانوں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پانوں کھل جاتا ، آخر پانوں اذخر کی گھاس سے چھپادیئے گئے ، یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آجاتا تو آنکھیں تر ہوجاتیں ، شہداء بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے ، جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا ، ان شہداء پر نمازِ جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی (۳) ، آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپؐ ادھر سے گذرے تو بے اختیار آپؐ پر رقت طاری ہوئی اور اس طرح آپؐ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو اور اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا کہ ''مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے ، لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ''۔)(۴)

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے ، تاہم یہ خیال کرکے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو ، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۴۲۱۔ (۲) ایضاً ص ۱۴۲۵۔ (۳) یہ صحیح بخاری کی روایت ہے ، لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہؓ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی ، یہ شہداء ایک ایک کرکے اور بعض میں ہے کہ دس دس کرکے لائے جاتے تھے اور آپؐ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی لاشِ مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی ، شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء ج ۱ ص ۲۹۰ و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید ص ۱۵۰ و مغازی واقدی ص ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ) ''س''۔ (۴) یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوۂ احد کے متفرق ابواب میں ہیں۔

روئے خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا، فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہوگئی جن میں حضرت ابوبکرؓ وزبیرؓ بھی داخل تھے ۔(۱)

ابوسفیان احد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا، آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا، دوسرے ہی دن آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے، چنانچہ حمراءِ اسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلۂ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا، لیکن در پردہ اسلام کا طرف دار تھا، اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا، ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا ''میں دیکھتا آتا ہوں محمد ﷺ اس سروسامان سے آرہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے'' غرض ابوسفیان واپس گیا (۲) یہی واقعہ ہے جس کو مورخین نے تکثیرِ غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنالیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا، آپؐ جس طرف سے گذرتے تھے، گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں، آپ ﷺ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں، لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے، رقت کے جوش میں آپ ﷺ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

اما حمزة فلا بواكى له (۳) لیکن حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصارؓ نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا میں تمہاری ہمدردی کا شکر گذار ہوں، لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں، (عرب میں دستور تھا کہ مردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیختی چلاتی تھیں، یہ رسمِ بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مردہ پر نوحہ نہ کیا جائے (۴)، یہ بھی بعد کو

(۱) (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۴) ''س''۔ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۴۲۸ و ۱۴۲۹۔ (۳) (مسند احمد ج ۲ ص ۸۴) ''س'' (۴) ابن ہشام (غزوۂ احد) ج ۲ ص ۸۸ اور مسند احمد (ج ۲ ص ۸۴)

ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں۔)(۱)

(قرآن مجید میں سورۂ آلِ عمران میں غزوۂ احد کا مفصل ذکر موجود ہے)

واقعاتِ متفرقہ ۳ھ ہجری: اس سال یعنی ۳ھ ہجری حضرت امام حسنؓ کی ولادت ہوئی، رمضان کی پندرہویں تاریخ تھی، اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحب زادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہوگئی تھیں، نکاح کیا، اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت کی صاحب زادی حضرت امِ کلثومؓ سے شادی کی۔

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا، اب تک وراثت میں ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہ تھا، ان کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی، مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

☆

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما ینھی عن النوح والبکاء ج ۱ ص ۱۷۴ ''س''۔

۴ ہجری

سلسلۂ (۱) غزوات وسرایا

تمام قبائلِ عرب بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے، دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین وآئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا، حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے، ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہِ معاش لوٹ اور غارت گری تھی اور اسلام اس کو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا، اس لئے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہوگیا تو ہمارے ذرائعِ معاش بند ہوجائیں گے، تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھادیا تھا، جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے، لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے، سیرتِ نبویؐ میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں، عام مورخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی، لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور اور ائمہ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریۂ ابی سلمہ: ا۔ سب سے پہلے ارمحرم ۴ ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے

---

(۱) غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں، زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت ﷺ خود شریک ہوئے، وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں صحابہ افسر مقرر کرکے بھیج دیئے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت ابوسلمہؓ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا، یہ خبر سن کران کی جماعت منتشر ہوگئی (۱)۔

سریۂ ابن انیس: ۲۔ اس کے بعد محرم ۴ ہجری میں سفیان بن خالد جو قبیلۂ لحیان کا تھا اور جو کوہستانِ عرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملہ کا قصد کیا، اس کے مقابلہ کے لئے آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو بھیجا جنہوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کردیا (۲)۔

صفر ۴ھ میں ابو براٗ کلابی (۳) جو قبیلہ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کردیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپؐ نے فرمایا ''مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے'' (۴) ابو براء نے کہا ''ان کا میں ضامن ہوں'' آپؐ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کردیئے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحابِ صفہ میں سے تھے، ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے شام کو فروخت کرکے کچھ اصحابِ صفہ کے نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے۔

سریۂ بیر معونہ: ان لوگوں نے بیرِ معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت ﷺ کا خط دے کر عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا، عامر نے حرام کو قتل کردیا اور آس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عصیۃ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑادیئے

---

(۱) ابن سعد ص ۳۵ (ج ۲ قسم اول) اصل عبارت یہ ہے بلغ رسول اللہ ﷺ ان طلیحۃ و مسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومھما ومن اطاعھما یدعونھم الی حرب رسول اللہ ﷺ) (۲) طبقات ابن سعد قسم اول ج ۲ ص ۳۶، اصل عبارت یہ ہے وذلک انہ بلغ رسول اللہ ﷺ ان سفین بن خالدا لھذلی .... قد جمع الجموع لرسول اللہ ﷺ . (۳) (ابو براٗ بعد کو اسلام لائے یا نہیں اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے، اصابہ میں ہے کہ ان کے قبولِ اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے، تاہم بعض روایات کی بناپر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے، زرقانی جلد ۳ ص ۸۶) ''س'' (۴) (اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا، اس نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ ''میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم بنو اور شہروں کا میں بنوں، یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ ورنہ غطفان کو لے کر میں چڑھ آؤں گا، آنحضرت ﷺ نے منظور نہیں فرمایا تھا، اس لئے اس کی طرف سے ڈر تھا) (صحیح بخاری غزوۃ الرجیع و رعل و ذکوان ج ۲ ص ۵۸۶)۔

کہ تیار ہوکر آئیں، ایک بڑا لشکر تیار ہوگیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا، صحابہؓ حرام کی واپسی کے منتظر تھے، جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے، راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا، کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب کو قتل کر دیا (۱) صرف عمرو (بن) امیہؓ (۲) کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں" یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا، مہینہ بھر نمازِ فجر میں ان ظالموں کے حق میں بددعا کی، حضرت عمروؓ بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا (جن کو رسول اللہ ﷺ امان دے چکے تھے) مگر حضرت عمروؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ کیا ہے (۳) (جب آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو) اس پر آپؐ نے ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کے خوں بہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا۔

واقعۂ رجیع: ان ہی دنوں عضل اور قارۃ جو دو مشہور قبیلے ہیں، ان کے چند آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں، آپؐ نے دس شخص ساتھ کر دیئے، جن کے سردار حضرت عاصم بن ثابتؓ تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے، تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور قبیلہ بنولحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں، بنولحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیرانداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آگئے، ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی، تیراندازوں نے ان سے کہا کہ "اتر آؤ ہم تم کو امن دیتے ہیں"، حضرت عاصمؓ نے کہا "میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا" یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ "اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے" غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیراندازوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے، (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے

---

(۱) (صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعبؓ بن زید بھی تھے، کفار نے سمجھا کہ یہ بھی شہید ہوگئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ گئے اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے، زرقانی ج۲ ص ۸۸) "س"۔ (۲) (حضرت عمروؓ بن امیہ اور حضرت منذرؓ بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے، جب یہ مقامِ حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذرؓ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمروؓ بن امیہ کو قید کرلیا گیا اور بعد کو وہ چھوڑ دیئے گئے، زرقانی ج۲ ص ۸۹) "س"۔ (۳) (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج۴ ص ۷۳ زرقانی ج۲ ص ۹۲)۔

گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو، قدرتِ خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارانہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پرا ڈال دیا، قریش نا کام پھر گئے) لیکن تین شخصوں (۱) نے جن (میں سے دو) کے نام حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ (بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اتر آئے، کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا، حضرت خبیبؓ نے جنگ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا، اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے (۲) چندروز ان ہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی، (۳) بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی، دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا ''کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کردوں گا''؟ ہمارا یہ کام نہیں'' خاندانِ حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا اور قتل کرنا چاہا، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، قاتلوں نے اجازت دی، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا ''دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں'' پھر یہ اشعار پڑھے:

وما ان ابالی حین اقتل مسلما	جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو
علی ای شق کان للّٰہ مصرعی	مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤں گا
وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء	یہ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیتا ہے (۴)،

---

(۱) (بخاری (کتاب المغازی) نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے، ان کا نام نہیں لکھا ہے، ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہؓ بن طارق بتلایا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ اسی وقت اسی موقع پر شہید کر دیئے گئے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکہ کے راستہ میں بہ مقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی ج ۲ ص ۷۸) ''س'' ۔ (۲) (حارث کے بیٹے ابوسروعہ جنہوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا بعد کو مسلمان ہوئے، اور شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے، زرقانی ج ۲ ص ۷۸) ''س'' ۔ (۳) (صحیح بخاری میں استرہ لکھا ہے) ''س'' ۔

(۴) طبری ج ۳ ص ۱۴۳۵ وطبقات ابن سعد قسم اول جزء ثانی ص ۴۰ ۔ اشعار اور اکثر جزئیاتِ واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع ج ۲ ص ۵۸۵ سے لئے گئے ہیں، نیز صحیح بخاری ھل یستاسر ومن لم یستاسر وصلی رکعتین عند القتل ۔

(اور یہ مستحب (۱) سمجھا جاتا ہے)۔

دوسرے صاحب حضرت زیدؓ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا، ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا، جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد ﷺ قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے"؟ بولے "خدا کی قسم میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ ﷺ کے تلوؤں میں کانٹا چبھ جائے" صفوان کے غلام نسطاس (۲) نے ان کی گردن ماردی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگذشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ ہجری: اسی سال شعبان میں حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی۔

اسی سال ازواجِ مطہرات میں سے زینبؓ بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں، تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زیدؓ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت ﷺ نے حضرت اِمِ سلمہؓ سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپؐ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپؐ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔

بعض مورخوں کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا، لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں، پوری تحقیق احکامِ شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

☆

(۱) اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی اول ص ۱۵) آنحضرت ﷺ کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا، (الروض الانف ج ۲ ص ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں، یعنی حضورؐ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضورؐ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا) "س" (۲) (نسطاسؓ نے بعد کو اسلام قبول کیا، زرقانی ج ۲ ص ۸۴) "س"۔

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

۲رہجری و ۳رہجری و ۴رہجری

اوپر گذر چکا ہے کہ یہود مدتِ دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے، انصار نے آکر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا، لیکن جنگِ بعاث نے ان کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہم سری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیں دار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے، قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے، اس لئے ہمیشہ ان کے پاس اسلحۂ جنگ کے ذخیرے مہیا رہتے تھے، انصار عموماً ان کے مقروض اور زیر بار تھے، ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ ان لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا، انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی آنکھ سے دیکھتے اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شایستہ سمجھتے تھے، جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے، وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دیں گے، چنانچہ مدینہ میں اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیت موجود تھے (۱)۔

یہود میں امتدادِ زمانہ سے نہایت اخلاق ذمیمہ پیدا ہو گئے تھے، ان کے امتیازی خصائصِ زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور تمام آبادی ان کے قرضوں میں زیرِ بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحبِ دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے،

(۱) ابوداؤد (ج ۲ ص ۹) کتاب الجہاد باب الاسیر۔

اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے، کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی (۱) اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائداد پر تصرف کرتے تھے۔

طمّاعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے، (۲) دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا اور چونکہ زیادہ تر امراء اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف درّہ مارنا ہے؟ اس نے کہا نہیں بلکہ سنگ سار کرنا ہے، لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہوگئی اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے، البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے، بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا درّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے (۳)۔

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب ان کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا، اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا، اسی قدر یہودیوں کے مذہبی وقار کو جوان کو مدتوں سے حاصل تھا، زوال ہوتا جاتا تھا، مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی، دفعتاً رک گئی، نئے نئے فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے، یہودیوں میں جو اخلاقِ بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولت مندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت ﷺ نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی، لیکن منصبِ نبوت کی حیثیت سے ذمائمِ اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپؐ کا فرضِ نبوت تھا، قرآن مجید میں ان کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف

(۱) بخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف ج۲ ص۵۷۶ و مسلم ذکر قتل کعب بن اشرف ج۲ ص۹۴۔ (۲) صحیح بخاری (کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر اوبعصا) جلد۲ ص۱۰۱۶ ''س'' (۳) اسباب النزول، واحدی صفحہ ۱۴۵ مصر، (و صحیح مسلم کتاب الحدود ذکر رجم الیہود ج۲ ص۶۹) ''س''۔

صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ۔۵ : ۴۲)	وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے ہیں اور مال حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ۔۵ : ۶۲)	اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء۔۴ : ۱۶۱)	اور چونکہ یہ سودخوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی، انہوں نے طرح طرح سے آنحضرت ﷺ کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں، لیکن آنحضرت ﷺ کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۚ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران۔۳ : ۱۸۶)	اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا (کی باتیں) سنو گے اور اگر صبر کئے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ سے سَلَامٌ عَلَیْکُم کرتے تو بجائے السَّلَامُ عَلَیْکَ کے السَّامُ عَلَیْکَ کہتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ "تجھ کو موت آئے" ایک دفعہ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں، انہوں نے سنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ "کم بختو! تم کو موت آئے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "نرمی سے کام لو" حضرت عائشہؓ نے کہا "آپ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگوں نے کیا کہا"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے عَلَیْکَ کہہ دیا(۱)۔

آنحضرت ﷺ صرف مجاملت اور درگذر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے، اہل عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے، صحیح بخاری میں ہے:

(۱) یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے۔

وكان يحب موافقة اهل الكتاب فيما لم يؤمر فيه بشئ (بخاری کتاب اللباس باب الفرق) (ج ۲ص ۸۷۷)

اور آنحضرت ﷺ ان چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکمِ الٰہی نہیں ہوتا تھا، اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے، آپؐ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں (۱) کسی یہودی کا جنازہ گذرتا تو آپؐ تعظیماً کھڑے ہوجاتے (۲)۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے بھی افضل ہیں، اس پر ایک انصاری کو غصہ آگیا، انہوں نے اس کو تھپڑ مارا، یہودی نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو اور پیغمبروں پر ایسی فضیلت نہ دو (جس سے ان کا نقص لازم آئے) قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہوجائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں" (۳)۔

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہورہے تھے، سرتاپا اہل کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (مائدہ۔۵:۵۵)

اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. (بقرہ۔۲: ۴۷)

اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کا خیال کرو جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔

تبلیغِ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، صرف اس قدر تھا:

---

(۱) (بخاری جلد اص ۵۶۲ باب اتيان اليهود النبی ﷺ حين قدم المدينة) "س" (۲) (بخاری جلد اص ۱۷۵) "س" كتاب الجنائز باب قيام الجنازة۔ (۳) بخاری جلد ۲ ص ۶۶۸ تفسیر سورۂ اعراف۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (آل عمران۔۳: ۶۴)

کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منھ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ اچھا تم گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہیں۔

ان باتوں میں سے ایک بھی ان کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی، لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہارِ لطف و مدارات کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کرلیا۔

اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لئے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو۔

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (نساء۔۴: ۵۱)

اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہوکر پھر مرتد ہوجائیں تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کرکے کوئی کیوں چھوڑ دیتا۔

وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّھُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ (آل عمران۔۳: ۷۲)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے، اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی ملکی تدبیریں اختیار کیں، وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے "اوس" اور "خزرج" جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے ان کو باہم متحد کردیا ہے، ان دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہوجائے گا، عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کردینا نہایت آسان کام تھا، ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کررہے تھے، چند یہودیوں نے اس صحبت میں جاکر جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑا، یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کردی تھی، اس لڑائی کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعتاً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، لعن وطعن سے گذر کر تلواریں کھنچ گئیں،

حسنِ اتفاق سے آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی، آپؐ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا، اس پر یہ آیت اتری: (۱)

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ.
(آل عمران۔۳ : ۱۰۰)

مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لائے بعد پھر کافر بنادیں گے۔

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگر چہ بظاہر مسلمان ہوگیا تھا، لیکن در حقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا، اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا، یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے در پردہ ملا لیا اور ان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی، اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو نکال دو، ورنہ ہم آ کر تمہارا استیصال کردیں گے، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا:

انكم اهل الحلقة والحصون وانكم تقاتلن صاحبنا او لنفعلن كذاو كذا، ولا يحول بيننا وبين خدم نسائكم شيئ (۲)

تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے حریف (محمد ﷺ) سے لڑو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے اور یہ کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔

ابوداؤد نے چونکہ بنونضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس لئے صرف بنونضیر کا نام لیا ہے، ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنونضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے، غرض اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو گھر سے نکلتے تھے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا، حضرت طلحہؓ بن براؓ ایک صحابی تھے، (انہوں نے انتقال کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت ﷺ کو خبر نہ کرنا، اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپؐ پر حادثہ گذر جائے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے (۳)۔

(۱) اصابه فی احوال الصحابه للحافظ ابن حجر العسقلانی، مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۸۸۔ (۲) سنن ابی داؤد ذکر نضیر (كتاب الخراج والا ماره ج ۲ ص ۶۷) "س"۔ (۳) دیکھو اصابہ ترجمہ طلحہ بن براءؓ قسم اول ج ۳ ص ۲۸۸۔

شوال ۲ھ ہجری غزوۂ بنی قینقاع: بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائلِ یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر قینقاع (۱) تھے، اس لئے سب سے پہلے ان ہی نے اعلانِ جنگ کی جرأت کی، آنحضرت ﷺ سے جو معاہدہ کیا تھا، سب سے پہلے ان ہی نے اس کی عہد شکنی کی، ابن ہشام وطبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے۔

ان بنی قینقاع کانوا اول یهود نقضوا مابینهم وبین رسول الله ﷺ وحاربوا فیما بین بدر واحد . (ابن ہشام ج ۲ ص ۵۶)

بنو قینقاع پہلے یہود تھے، جنہوں نے اس معاہدہ کو جوان میں اور آنحضرت ﷺ میں تھا، توڑ ڈالا اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔

ابن سعد (۲) نے غزوۂ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے:

فلما کانت وقعة بدر اظهروا البغی والحسد و نبذوا العهدو المرة (زرقانی جلد ا ص ۵۲۹)

واقعۂ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ دیا۔

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا، جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا، ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں (نقاب پوش) آئیں، یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا، آنحضرت ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ”خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے“ بولے کہ ”ہم قریش نہیں ہیں ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے“، چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہو گیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے، پندرہ دن تک محاصرہ رہا، بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ جو فیصلہ کریں گے، ان کو منظور ہوگا، عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا، اس نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ وہ جلا وطن کر دیئے جائیں (۲) غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے، جلا وطن کر دیئے گئے، یہ سات سو

(۱) طبقات ابن سعد (ج ۲ قسم اول ص ۱۹) ”س“۔ (۲) ایضاً (۳) عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے، عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے، لیکن سنن ابی داؤد کتاب الخراج باب فی خبر النضیر ج ۲ ص ۶۷ و ۶۸ میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔

شخص تھے، جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ ہجری کا واقعہ ہے۔

قتلِ کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ ہجری: یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کے باپ اشرف نے جو قبیلۂ طے سے تھا، مدینہ میں بنونضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا کہ ابورافع بن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب (۱) تھا، اس کی لڑکی سے شادی کی، کعب (۲) اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دوطرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا، رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علماء اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے، تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنالیا تب ان کے مقررہ روزینے جاری کئے (۳)۔

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی، بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا، تعزیت کے لئے مکہ گیا، کشتگانِ بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی، لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا، ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کئے ہیں، اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں، تاہم جہاں تک اس زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں:

طحنت رحی بدر لمھلک اھلہ	جنگِ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا،
ولمثل بدر تستھل وتدمع	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہئے،
کم قد اصیب بہ من ابیض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذی بھجة تاوی الیہ الضیع	یہاں اہلِ حاجت پناہ لیتے تھے مارے گئے،

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہتا اور لوگوں کو آنحضرت ﷺ

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب قتل النائم المشرک ج۱ص۴۲۴۔ (۲) الخمیس صفحہ ۴۶۴۔ (۳) زرقانی ج۲ ص۹ بہ حوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا(۱)۔

عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے، تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا ، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا، سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے(۲)۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت ﷺ کو قتل کرا دے، علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنونضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں:

کعب بن الاشرف الیھودی الذی اراد ان یمکر برسول اللہ ﷺ	کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت ﷺ کو دھوکے میں قتل کردینا چاہا۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۳) (ذکر کعب اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت ﷺ کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کردیا کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کردیں، حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے، لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپؐ نے بعض صحابہ سے شکایت کی اور آپؐ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بہ مشورہ رؤسائے اوس (۴) جا کر اس کو ربیع الاول ۳ ہجری میں قتل کر دیا،

(۱) ابوداؤد میں ہے، وکان کعب بن الاشرف یھجوا النبی ﷺ و یحرض علیه کفار قریش (ابوداؤد جلد دوم باب کیف کان اخراج الیھود، کتاب الخراج والامارہ) ص ۶۶ ''س'' ابن سعد میں ہے، کان رجلا شاعرا یھجوا النبی واصحابه ویحرض علیه (تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ ص ۷۹ میں ہے ان کعب بن اشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشھم علی النبی ﷺ وامرھم ان یغزوه)''س''
(۲) خمیس ص ۵۱۷ غالباً یہ وہی پہلا واقعہ ہے، ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے۔ (۳) (جلد ۷ ص ۲۵۹) ''س'' (۴) ابن سعد مغازی ص ۲۱۔

ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے آپؐ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ’’ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے‘‘ ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی کیوں کہ ’’الحرب خدعة‘‘ یعنی لڑائی میں دھوکا دینا جائز ہے، لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے:

فاذن لی ان اقول　　ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ (لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے) حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا ’’ہم نے محمد ﷺ کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنالیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے، اب تم ہی سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے‘‘ کعب نے کہا ’’تم خود محمد ﷺ سے اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو‘‘ محمد بن مسلمہؓ نے کہا ’’تمہارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں ہے‘‘ اس نے کہا ’’اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو‘‘ انہوں نے کہا ’’اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی، ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی جیسی ضرورت ہے‘‘ (۱)

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے باہر بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی اور قتل کر ڈالا (۲) لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں کی اجازت دی تھی، اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوۂ بنونضیر ربیع الاول ۴ھ ہجری: حضرت عمروؓ بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیئے تھے اور جن کا خوں بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کے رو

(۱) (زرقانی جلد ۲ ص ۱۳ و صحیح بخاری قتل کعب بن اشرف ج ۲ ص ۵۷۶) ’’س‘‘۔ (۲) صحیح بخاری باب قتل کعب (کتاب المغازی) ج ۲ ص ۵۷۷۔ ’’س‘‘۔

سے یہودِ بنی نضیر پر واجب الادا تھا، اس کے مطالبہ (۱) کے لئے آنحضرت ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے قبول کیا، لیکن در پردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالا خانہ پر چڑھ کر آنحضرت ﷺ پر پتھر گرا دے، اتفاق سے اس وقت آپؐ بالا خانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے، عمرو بن حجاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا، آپؐ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہوگیا، اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے (۲)

اوپر گذر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد ﷺ کو قتل کردو، ورنہ ہم خود آ کر تمہارا بھی استیصال کردیں گے، بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے، قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا، بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار لے کر آئیں گے، آپؐ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپؐ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا، چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے، آپؐ یہودِ بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدیدِ معاہدہ کی درخواست کی، انہوں نے تعمیل کی، بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے، لیکن وہ کسی معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے (۳) بالآخر انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؐ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں، یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے، آپؐ نے منظور فرمایا، لیکن راہ میں آپؐ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب

---

(۱) [بنی نضیر سے آنحضرت ﷺ نے دیت کے متعلق جو گفتگو فرمائی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں، ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے، دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بنی نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی، اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے، بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے، اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرین قیاس بھی ہے] (سیرۃ حلبیہ ج ۲ ص ۲۷۷) ''س''۔ (۲) یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے ج ۲ ص ۱۴۲، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے، وکانوا اقد دسّوا الی قریش فی قتاله ﷺ فحضو هم علی القتال و دلوهم علی العورة (زرقانی ج ۲ ص ۹۳) یعنی ان لوگوں نے قریش سے در پردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ان کو مخفی موقع بتائے۔ (۳) یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد (خبر النضیر کتاب الخراج والامارہ ج ۲ ص ۶۷ ''س'') میں ہے، تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔

آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں (۱)

بنونضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے، وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزیں تھے جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا تھا کہ ''تم اطاعت نہ کرنا، بنوقریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کو آؤں گا'' قرآن مجید میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ. (حشر۔۵۹ : ۱۱)

تم نے دیکھا! منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے، اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔

لیکن بنونضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنوقریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق علانیہ اسلام کے مقابلہ میں آ نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے پندرہ تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جوان کے نخلستان تھے، ان کے چند درخت کٹوا دیئے، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا، بلکہ صرف لینہ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیئے گئے تھے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ. (حشر ۔۵۹ : ۵)

تم نے لینۃ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب خدا کے حکم سے تھا، تا کہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لئے وہ صاف کرا دیئے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو (۲)۔

---

(۱) فتح الباری واقعۂ غزوۂ بنونضیر جلد سابع صفحہ ۲۵۵۔ فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنونضیر نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا، بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے (کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر و مخرج رسول اللہ ﷺ الیهم فی دیة الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول الله ﷺ ج۲ص۵۷۴۔ (۲) (مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں جب کاٹے بغیر چارۂ کار نہ ہو، محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے، نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ اگر دشمن درختوں (کے آڑ) میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا، عمدۃ القاری جلد ۸ ص ۱۹۱)''س''۔

بالآخر بنونضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جاسکیں، لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں، چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معزز روٴسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیّ بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کرلیا (۱) اس واقعہ کو اس غرض سے یادرکھنا چاہئے کہ یہ غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنونضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے، لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروہ بن الوَرد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہلِ مدینہ کا بیان ہے کہ اس سرو سامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی، (۲) ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خُود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اور یہودی ان کو اتحادِ مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ ۔۲ : ۲۵۶) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔

ابوداوٴد نے کتاب الجہاد ''باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام'' کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے (۳)

☆

(۱) طبری ج ۳ صفحہ ۱۴۵۲ (۲) یہ تفصیل طبری میں ہے (ج ۳ ص ۱۴۵۲) ''س'' (۳) ج ۲ ص ۹ مطبع محمدی، دہلی۔

۵ ؍ہجری

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک وغزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگادی، جس قدر قبائل تھے، سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا، لیکن آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی، ۱۰ ؍محرم ۵ ؍ہجری کو آپؐ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے، لیکن آپؐ کی آمدسن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے (۱)۔

ربیع الاول ۵ ؍ہجری میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے، آنحضرت ﷺ ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع (۲) یا بنی مصطلق شعبان ۵ ؍ہجری: خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا، قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم کی نسل سے ہیں، اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہئے، حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے، لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں، لیکن

(۱) ابن سعد غزوۂ ذات الرقاع ص ۴۳ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی)۔ (۲) (ابن اسحاق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے، اس غزوہ کو ۶ ؍ہجری میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۵ ؍ہجری میں واقع ہوا، امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن غلطی سے ۵ ؍ہجری کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۴ ؍ہجری کی نسبت کی ہے، علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۷ ص ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے ۵ ؍ہجری کو ترجیح دی ہے، ابن سعد نے بھی ۵ ؍ہجری ہی لکھا ہے، تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری)۔

ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہئے، جو حدودِ حرم کے اندر ہے، اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے، ان کو بھی یہ لقب دے دیتے اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے، قبیلہ خزاعہ (۱) کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنوالمصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے، آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے حضرت زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آ کر خبر کی تصدیق کی، آپؐ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲/شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں، مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے، انہوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے، مسلمانوں نے دفعتاً ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے (دس آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہوگئے، جن کی تعداد تقریباً چھ سو تھی، غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں)۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری (۲) اور صحیح مسلم (۳) میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنوالمصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے، ابن سعد (۴) نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے، لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصولِ حدیث کے رو سے قابلِ حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لئے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں منقطع ہے (۵)۔

---

(۱) یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں (ص ۶۷ جلد اول)۔ (۲) باب فی العتق باب من ملک من العرب ج ۱ ص ۳۴۵۔ (۳) کتاب الجهاد والسیر باب جواز الاغارة علی الکفار ج ۲ ص ۷۱۔ (۴) طبقات ابن سعد جلد ۲ مغازی ص ۴۵ و ۴۶۔ (۵) معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغازِ سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متنِ حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی هذا الحدیث عبدالله بن عمرو کان فی ذلک الجیش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے، (مسلم کتاب الجهاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے)" س"۔

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی، لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے، اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے، یہ بد باطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا، انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یا للانصار کا نعرہ مارا، (انصار کی ج) مہاجر نے بھی یا معشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا، نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دست گیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے"۔

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر کہا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے، آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ "محمد ﷺ اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں (۱)"۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن ابی جس درجہ کا منافق اور دشمنِ اسلام تھا، اس کے صاحب زادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے، آنحضرت ﷺ کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپؐ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گذار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو، میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپؐ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں" آپؐ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا (۲)، یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپؐ نے خود پیراہنِ مبارک عنایت فرمایا، جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا

(۱) دیکھو صحیح بخاری کتاب التفسیر باب اذا قیل لھم تعالوا الخ ج ۲ ص ۷۲۸۔ (۲) یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد (ج ۲ ص ۴۵ و مابعد) اور طبری (ج ۳ ص ۱۵۱۵) نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔

کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ: لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے، ان میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں، ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے، حضرت جویریہؓ حضرت ثابتؓ ابن قیس کے حصہ میں آئیں، انہوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ ''مکاتبت کرلو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو'' حضرت ثابتؓ نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کردیں، آنحضرت ﷺ کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے، جو یقیناً ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت ﷺ پر بھی ان کے حسن و جمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا، غرض وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں، (آپؐ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کروگی، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کردوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں''۔ حضرت جویریہؓ نے کہا ''میں نے منظور کیا(۱)'') آپؐ نے تنہا وہ رقم ادا کردی اور ان سے شادی کرلی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریقِ روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا، حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپؐ اس کو آزاد کردیں، آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، حارث نے جا کر جویریہؓ سے کہا کہ محمد نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا، انہوں نے کہا ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں''

(۱) ابوداؤد کتاب العتاق باب فی بیع المکاتب الخ ج۲ ص۱۹۲۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن مندہ (۱) سے نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے" ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے، ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زرفدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں، تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

جویریہ کے نکاح کا اثر: حضرت جویریہؓ سے جب آپ نے نکاح کیا تو تمام اسیرانِ جنگ جو اہل فوج کے حصہ میں آ گئے تھے، دفعتاً رہا کر دیئے گئے، فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ ﷺ نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا (۲)۔

واقعۂ افک: واقعۂ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا، احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے، لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے" اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے، یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی، لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آ گئے، جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوشِ مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آ گئی ہے، لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔

یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔

(۱) یہ ابوقلابہ کی مرسل روایت ہے، ابن مندہ کی روایت دوسرے مفہوم کی اس سے قبل متصلاً مذکور ہے غالباً مصنف کو اشتباہ اسی لئے ہوا۔ (ض)۔ (۲) سنن ابی داؤد کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبة ج۲ص۱۹۲) "س"۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق: بنو نضیر (۱) مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی، ان کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیی ابن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا ''اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جا سکتا ہے''، قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے، قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصۂ غزوۂ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیسِ قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی (۲) اس لئے یہ فوراً تیار ہو گئے) بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ، قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انہوں نے بھی ساتھ دیا، بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا، غرض تمام قبائلِ عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا، فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی۔ (۳)

یہ لشکر تین مستقل فوجوں (۴) میں تقسیم (تھا) غطفان کی فوجیں (۵) عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں، جو عرب کا مشہور سردار تھا، بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے اور ابو سفیان (بن حرب)

---

(۱) طبری میں ہے کان الذی جر غزوۃ رسول اللّٰہ الخندق فیما قیل ما کان من اجلاء رسول اللّٰہ ﷺ بنی النضیر عن دیارھم (ج ۳ ص ۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری غزوہ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے، خرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکۃ یحرض قریشا علی حرب رسول اللّٰہ ﷺ وخرج کنانۃ بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان و یحضھم علی قتال رسول اللّٰہ ﷺ علی ان لھم نصف تمر خیبر فاجابہ عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ بن بدر الفزاری الی ذلک و کتبوا الی حلفائھم من بنی اسد فاقبل الیھم طلحۃ بن خویلد فیمن اطاعہ الخ (ج ۷ ص ۳۰۱)۔ (۲) صحیح بخاری غزوۃ الرجیع ج ۲ ص ۵۸۶ (۳) (طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صفحہ ۴۷ و فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۱) ''س''۔ (۴) (طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول صفحہ ۴۷) ''س''۔ (۵) (افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں، چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا، بنو مرہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، زرقانی ج ۲ ص صفحہ ۱۲۱، طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول ص ۴۷) ''س''۔

سپہ سالارِ کل تھا۔(۱)

آنحضرت ﷺ نے یہ خبریں سنیں تو صحابہؓ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے، انہوں ے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے، خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہے، جس کے معنٰی کھودے گئے کے ہیں، کاف، خ، سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہوگیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کئے گئے۔

مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا، جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا، آنحضرت ﷺ نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں، یہ ذوقعدہ ۵ھ ہجری کی ۸ تاریخ تھی۔

آنحضرت ﷺ نے حدود خود قائم کئے، داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا، بیس دن میں تین ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہوگا کہ جب مسجدِ نبویؐ بن رہی تھی تو سرورِ دو جہاں مزدوروں کی صورت میں تھے، آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے، جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لادلاد کر پھینکتے ہیں اور جوشِ محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں:

نحن الذین بایعوا محمدا   علی الجهاد ما بقینا ابدا

سرورِ عالم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے، اسی حالت میں یہ رجز زبان پر ہے:

واللہ لو لا اللہ ما اهتدینا   ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینة علینا   وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الأولی قد بغوا علینا   اذا ارادوا فتنة ابینا

ابینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر کہتے تھے (۲) اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے:

---

(۱) (طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول صفحہ ۴۷) ''س''۔ (۲) صحیح بخاری غزوۂ احزاب ج ۲ ص ۵۸۹۔

اللھم انہ لاخیر الاخیر الآخرۃ فبارک فی الانصار والمھاجرۃ

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آگئی، کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا، آپؐ نے دست مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی (۱)۔

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی، مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہؓ بن اسلم دو سو آدمیوں کے ساتھ متعین کیے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنو قریظہ کے یہود اب تک الگ تھے، لیکن بنو نضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی، حیی بن اخطب (حضرت صفیہؓ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا ''میں فوجوں کا دریائے بیکراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب امنڈ آیا ہے اور ایک محمد ﷺ کے خون کا پیاسا ہے، یہ موقع ہاتھ سے دینے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے''۔ کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا میں نے محمد ﷺ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، ان سے عہد شکنی کرنا خلاف مروّت ہے، لیکن حیی کا جادو رائگاں نہیں جاسکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمامِ حجت کے لئے سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بھیجا اور فرما دیا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے، دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا تو انہوں نے کہا ''ہم نہیں جانتے محمد ﷺ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے''۔

غرض بنو قریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا، قریش، یہود اور قبائل عرب کی دس ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین طرف اس زور شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے :

(۱) صحیح بخاری غزوۂ احزاب ج ۲ ص ۵۸۹۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا.

(احزاب۔۳۳:۱۰تا۱۱)

جب کہ دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں اور کلیجے منہ میں آگئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آگیا اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیئے گئے۔

فوجِ اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھی، لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بے شمار فوجوں کا ہجوم، ایسے واقعات تھے جنہوں نے ان کا پردہ فاش کردیا، آ آ کر آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَّمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا

(احزاب۔۳۳ : ۱۳)

کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں، بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

لیکن جاں نثارانِ اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا

(احزاب۔۳۳ :۲۲)

جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے اور اس کے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے ان کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں، لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے(۱)، محاصرہ اس قدر شدید اور پر خطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے اسی موقع پر حضرت زبیرؓ کو

(۱) شمائل ترمذی۔ عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پتھر باندھتے تھے، جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی۔

حواری کا لقب دیا(۱)

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ادھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے اہل وعیال یہیں قلعوں میں پناہ گزیں تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، آنحضرت ﷺ نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمت ہار جائیں، اس لئے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے، حضرت سعدؓ بن عبادۃ اور حضرت سعدؓ بن معاذ کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا، دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے، یہ استقلال دیکھ کر آپؐ کو اطمینان ہوا، حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹادی (۲) اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا، ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا، خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔

چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے تمام فوجیں یک جا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے، خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی،

(۱) صحیح بخاری ذکر غزوۂ احزاب ج ۲ ص ۵۹۰ (وصحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ باب من فضائل طلحۃ والزبیر ج ۲ ص ۳۲۹، لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے، حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیقِ حال کے لئے حضرت حذیفہؓ اور بنو قریظہ کی تحقیقِ خبر کے لئے حضرت زبیرؓ گئے تھے، یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے، فتح الباری ج ۷ ص ۳۱۲، زرقانی جلد ۲ ص ۱۳۸)''س''۔ (۲) طبری (ج ۳) ص ۱۴۷۴۔

یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا، عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدوُدّ نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو ابن عبدوُدّ تھا، وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، جنگِ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا، اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں" لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدوُدّ ہے، حضرت علیؓ بیٹھ گئے، لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی، تیسری دفعہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے، تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے، غرض آپؐ نے اجازت دی، خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ "کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا" حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے، پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی:

حضرت علیؓ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا۔
حضرت علیؓ	لڑائی سے واپس چلا جا۔
عمرو	میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔
حضرت علیؓ	مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی، حضرت علیؓ پیادہ تھے، عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا، گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں، پھر پوچھا کہ تم کون ہو آپ نے نام بتایا، اس نے کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا، آپ نے فرمایا "ہاں لیکن میں چاہتا ہوں" عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا، پرتلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا، حضرت علیؓ نے سپر پر روکا، لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل

آئی اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا، تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا، قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا، دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا، ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی، ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا، عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا، لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا، حضرت عمرؓ فاروق نے ضرار کا تعاقب کیا، ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا، لیکن روک لیا اور کہا عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہ نے تیر مارنے شروع کئے اس نے کہا مسلمانو! ''میں شریفانہ موت چاہتا ہوں'' حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر تلوار سے مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔(۱)

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا، تمام دن لڑائی رہی، کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینھ برسا رہے تھے اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی، یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متصل (۲) چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیراندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں، بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا، یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا، حضرت صفیہؓ (آنحضرت ﷺ کی پھوپھی) نے دیکھ لیا، مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کردیئے گئے تھے، حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کردو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا، حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا، جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ

---

(۱) یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے، ابن سعد قسم اول جلد ۲ ص ۴۹ و مابعد اور خمیس غزوۂ خندق مبارزۃ علی ج ۱ ص ۴۸۷ سے ماخوذ ہے۔ (۲) اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن کی ملا کر زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

سکتے تھے، اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا، حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا، حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ، حسانؓ نے کہا جانے بھی دیجئے، مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں، لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی، یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے، اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی (۱)۔

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا، محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے، دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آگیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولھوں پر الٹ الٹ جاتے تھے، اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا، اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادِ صرصر کو عسکرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب۔ ۳۳ : ۹)	مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آپڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے، وہ اسلام لا چکے تھے، لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا، انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے (ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں) اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت ﷺ نے الحرب خدعة کی تعلیم کی تھی، لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے، اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے، ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن

(۱) زرقانی بہ حوالہ طبرانی و بزار و ابو یعلی بہ سند (حسن) دیکھو ص ۱۲۹ ج ۲ و ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۴۔

کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے، اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہودِ بنی قریظہ اول اول نقضِ عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمد ﷺ سے معاہدہ کیوں توڑیں، لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ ''قریش چلے گئے، تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گا''، قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے، اس لئے جب انہوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی، اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی (۱)

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علاحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے، ابوسفیان نے فوج سے کہا رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبلِ رحیل بجنے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰۔۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَّكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (احزاب۔۳۳:۲۵)	اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی۔

(۱) مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے (کتاب المغازی ص ۳۶۲) جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، اس روایت کے رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کر دیں گے لیکن انہوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انہوں نے خفیہ رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلاوطن کر دیئے گئے تھے، پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے، نعیم بن مسعود اشجعی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے، ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے، حضور انور ﷺ نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا، انہوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچا دیا، اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی ہو گئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا، دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۱۳ مصر) ''س''

اس معرکہ میں فوجِ اسلام کا جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعدؓ بن معاذؓ جو قبیلۂ اوس کے سردار تھے، زخمی ہوئے اور پھر جاں بر نہ ہو سکے، ان کے زخم کھانے کا واقعہ موثر اور عبرت انگیز ہے۔

حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزیں تھیں، حضرت سعدؓ بن معاذؓ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا تو سعد ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے :

لبث قليلا يشهد الهيجا جمل (۱) — لاباس بالموت اذالموت نزل

ذرا ٹھہر جانا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے — وقت جب آگیا تو موت سے کیا ڈر ہے۔

حضرت سعدؓ کی ماں نے سنا تو پکاریں، بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی، سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے، حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کی ماں سے کہا کاش سعدؓ کی زرہ لمبی ہوتی، اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی، خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی (۲) اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں، جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، یہ خیمہ ان ہی کا تھا اور وہ علاج کی نگراں تھیں، آنحضرت ﷺ نے خود دستِ مبارک سے مشقص (۳) لے کر داغا، لیکن پھر ورم کر آیا، دوبارہ داغا لیکن پھر فائدہ نہ ہوا، کئی دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انہوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ: اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آغازِ قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی، لیکن جب قریش نے ان کو

(۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۳ و طبری ج ۳ ص ۱۴۷۷ و خمیس ج ۱ ص ۴۸۸ مگر تینوں کتابوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے ع ۔۔ لاباس بالموت اذاحان الاجل ''ک، ص''۔ (۲) یہ خمیس کا بیان ہے ج ۱ ص ۴۹۹، حافظ ابن حجر نے اصابہ ذکر رفیدہ میں امام بخاری کی ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، حضرت سعدؓ ان ہی کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے، ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبویؐ کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے ج ۸ ص ۸۱۔ (۳) مسلم کتاب السلام باب لکل داءٍ دواء ج ۲ ص ۲۵۲۔

تحریض وتہدید کا خط لکھا تو وہ آمادۂ بغاوت ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے تجدیدِ معاہدہ کرنی چاہی، بنونضیر نے انکار کیا، اور وہ جلا وطن کر دیئے گئے، لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا (۱)، چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا، صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

عن ابن عمر ان یهود بنی النضیر و قریظة حاربوا رسول ﷺ فاجلیٰ رسول ﷺ بنی النضیر واقر قریظة ومنّ علیهم (کتاب الجهاد باب اجلاء الیهود من الحجاز ج۲ص۷۶)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنونضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت ﷺ سے لڑائی کی تو آپ نے بنونضیر کو جلا وطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

بنونضیر جب جلا وطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیؑ بن اخطب، ابورافع، سلام بن ابی الحقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاستِ عام حاصل کر لی، جنگِ احزاب ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، قبائلِ عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے، لیکن حیؑ بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے، تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آ رہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ (۲) شرکت کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیؑ بن اخطب کو ساتھ لائے (۳)

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے، آنحضرت ﷺ نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں، قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے

---

(۱) واقدی نے حیؑ بن اخطب کی زبانی بنوقریظہ کے اس معاہدہ کر کے ٹھہر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے، حیؑ بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے ٹھہر گئے ہیں تاکہ موقع پا کر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں، مغازی واقدی ص ۳۶۲ کلکتہ) "س"۔ (۲) سر ولیم میور صاحب اربابِ سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنوقریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا، ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا، لیکن قرآن مجید میں صاف یہ الفاظ ہیں، وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ، مظاہرہ (امداد) سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے۔ (۳) طبری (ج ۳ ص ۱۴۸۷ "س") و ابن ہشام صفحہ ۱۴۶ جلد دوم۔

تھے، فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں (۱)، غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا، بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا، آنحضرت ﷺ توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے، چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلۂ نماز، رجم، قصاص بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے توراۃ ہی کی پابندی فرمائی، حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے (۲) توراۃ کے مطابق تھا، توراۃ کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے اگر وہ صلح تسلیم کرلیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں، سب کو قتل کردے باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گی''۔

احادیث میں مذکور ہے کہ سعدؓ نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا، یہ اسی توراۃ کے حکم کی طرف اشارہ تھا، یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکمِ الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

---

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۴۸۵ ''س'') میں ہے، حتی اذا دنا من الحصون سمع منها مقالة قبيحة لرسول الله ﷺ منهم۔ (۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۷ (باب جواز قتال من نقض العهد وجواز انزال اهل الحصون على حكم حاكم عدل اهل للحكم ''س'') اور نیز بخاری کتاب المغازی (باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب ج ۲ ص ۵۹۱ ''س'') میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے، مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعدؓ بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہوگئے، اس لئے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز، ابن العرقۃ قریشی تھا، قریظی نہ تھا، صحیح بخاری و مسلم میں صاف یہ تصریح ہے۔۱۲

حیَ بن اخطب جوان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے:

اما واللہ ما لمت نفسی فی عداوتک ولکنہ من یخذل اللہ یخذل .

ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ایھا الناس انہ لا باس بامر اللہ کتاب وقدر وملحمۃ کتبھا اللہ علی بنی اسرائیل (۱)

لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔

حیَ بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا (۲) اس معاہدہ پر اس نے خدا کو ضامن کیا تھا، لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گذر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفینِ اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے، لیکن واقعات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا، جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے، یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خوں بہا دینا پڑتا تھا، بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خوں بہا ادا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا (۳)۔

۳۔ آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

---

(۱) یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوۂ بنی قریظہ ج ۲ ص ۱۷۱) میں ہیں، طبری ج ۳ ص ۱۴۹۴ میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں

(۲) بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے ج ۱۴ ص ۴۲۵، دار السلفیہ بھنڈی بازار، بمبئی) ''س'' (۳) ابوداؤد کتاب الدیات باب النفس بالنفس ج ۲ ص ۲۶۱) ''س''

۵۔ازواج مطہراتؓ قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔حیؔ بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتشِ جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

ان حالات کے ساتھ بنوقریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ عرب میں محالفت کا معاہدہ اخوتِ حقیقی کے برابر تھا، بنوقریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی، حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے وہ سخت کشمکش میں تھے، ان کے حلیفوں کی موت وحیات کا مسئلہ تھا، جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے، لیکن حضرت سعدؓ بن معاذ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد اربابِ سیر نے ۶۰۰ سے زائد بیان کی ہے، لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے، ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلاد) (۱) کو قتل کر دیا تھا، اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی، سنن ابی داؤد میں وہ حسب ذیل (۲) حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے۔

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے، قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے، ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی، لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی، دفعتاً قاتل نے اس کا نام پکارا، وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہاں؟ بولی میں نے ایک جرم کیا تھا، اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں، خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

حضرت عائشہؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں، تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

---

(۱) (ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ ج ۲ ص ۱۷۲۔ (۲) ابوداؤد (کتاب الجہاد باب فی قتل النساء ج ۲ ص ۶) ''س''

ریحانہ کا غلط واقعہ: متعدد اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، چنانچہ جن مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے، انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ، عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے، ایک مورخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ ''بانیِ اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آ کر تفریح خاطر کے لئے ....۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں، سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں، لیکن واقدی نے بہ تصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا، ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فاعتقنی وتزوج بی — پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا۔

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخِ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

وکانت ریحانۃ القرظیۃ زوج النبی تسکنہ۔ — اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترم) تھیں، اس مکان میں رہتی تھیں۔

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثینِ مابعد کا ماخذ ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں(۱):

واستسریٰ ریحانۃ من بنی قریظۃ ثم اعتقھا فلحقت باھلھا واحتجبت وھی عند اھلھا۔ — ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وھذہ فائدۃ جلیلۃ اغفلھا ابن الاثیر

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد

(۱) دیکھو اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ریحانہؓ (ج ۸ ص ۸۸) ''س''۔

کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر مان لیا جائے کہ وہ حرمِ نبویؐ میں آئیں تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں (۱)۔

حضرت زینبؓ سے نکاح ۵ ہجری: اس سال آنحضرت نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا، نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواجِ مطہرات کا عنوان ہے، لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے، جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا، عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت ﷺ کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذاً باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں، جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟۔

آنحضرت ﷺ نے زیدؓ کو جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے، متبنیٰ بنا لیا تھا، جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپؐ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں، (ان کی ماں امیمہ، عبدالمطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے، اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔

وکان رسول اللہ ﷺ اراد ان یزوجھا زید بن حارثۃ مولاہ فکرھت ذلک (۲)

آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا تو انہوں نے ناپسند کیا۔

---

(۱) حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں، ایک یہ کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں، یہ روایت ابن مندہ کی ہے مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں، دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنین کے رکھنا چاہا، مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور ﷺ کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے، تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے ان کو مختار بنا دیا، تو انہوں نے اسلام قبول کیا تو آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، یہ روایت واقدی کی ہے، ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا، دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۰۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے، بہ حوالہ سابق، تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانہ ج ۸ ص ۸۸) ''س'' (۲) فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بہ حوالہ ابن ابی حاتم ج ۸ ص ۴۰۳۔

لیکن بالآخر آنحضرت ﷺ کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہوگئیں، قریباً ایک سال تک حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں، لیکن دونوں میں ہمیشہ شکررنجی رہتی تھی، یہاں تک کہ زیدؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی اوران کو طلاق دینا چاہا۔

جاء زيد بن حارثة فقال يا رسول الله ان زينب اشتد علىّ لسانها وانا اريد ان اطلقها (١)

زید، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینبؓ مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

لیکن آنحضرت ﷺ بار باران کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں، قرآن مجید میں ہے:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰهَ.

(احزاب۔۳۳: ۳۷)

اور جب کہ تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو، اور خدا سے خوف کرو۔

لیکن کسی طرح صحبت برآنہ ہوسکے اور آخر حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضرت زینبؓ آنحضرت ﷺ کی بہن تھیں اور آپؐ ہی کی تربیت میں پلی تھیں، آپؐ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کرلیا تھا، جوان کے نزدیک ان کے خلافِ شان تھا، لیکن آنحضرت ﷺ جو مساواتِ اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی، بہرحال جب وہ مطلقہ ہوگئیں تو آپؐ نے ان کی دل جوئی کے لئے خودان سے نکاح کرلینا چاہا، لیکن عرب میں اس وقت تک متبنٰی اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپؐ تامل فرماتے تھے، لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اوراس کا مٹانا مقصود تھا، اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ

(احزاب۔۳۳: ۳۷)

اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر کردینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو، حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیے۔

غرض آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کرلیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنٰی اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے، مٹ گئی، اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے، لیکن امرِ حق کے اجراء میں مطاعن کا آماج گاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے، گو سرتاپا

(۱) فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بہ حوالۂ روایت عبدالرزاق از معمر از قتادہ ۔ج ۸ ص ۴۰۳۔

کذب و افترا ہے، لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ زیدؓ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے، حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے:

سبحان الله العظیم سبحان الله مصرف القلوب . (۱)	پاک ہے خدائے برتر، پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپؐ کو پسند آ گئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے، ''نقل کفر، کفر نہ باشد'' یہی روایت ہے جو عیسائی مورخوں کا مایۂ استناد ہے، لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصول فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مورخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے، جو مشہور کذّاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں، لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے، حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں، تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) (۲) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

وورد ت آثار اخری اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها .	اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے۔ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہئے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر ههنا اثاراً عن بعض السلف رضی الله عنهم احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے

(۱) تاریخ طبری آغاز واقعات ۵ ہجری ج ۳ ص ۱۴۶۱ ۔ (۲) ج ۸ ص ۴۰۳۔

وقد روی الامام احمد ھھنا ایضا من روایة حماد بن زید عن ثابت عن انس رضی اللہ عنه فیه غرابة ترکنا سیاقه ایضا. (۱)

متعلق انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے، ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا، حضرت عائشہؓ پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے، منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے، جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی، یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں، لیکن وہ محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور عدالتِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً امام بخاریؒ امام مسلمؒ وغیرہ ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعاتِ متفرقہ ۵ ہجری: (اس سال کی تاریخِ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے، اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں، اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں، جس سے منہ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں جھنک جھنک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں، تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں، ازواجِ مطہراتؓ کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا، اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی، زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی، عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی، اس سال "حدِ قذف" نازل ہوئی، جس کے رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا، بصورت عدمِ وجود شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا، یعنی زن و شوہر دونوں اپنی سچائی اور فریقِ ثانی کی دروغ گوئی کا

---

(۱) تفسیر ابن کثیر تفسیر سورۂ احزاب ج ۳ ص ۴۹۱ مصر ۱۹۳۷ء

بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے (۱)۔

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی، جس کو ظہار کہتے ہیں، اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے، بروایت صحیحہ نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی)۔

☆

---

(۱) بخاری جلد ۲ ص ۷۰۷ و سیرت گازرونی قلمی، ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۲، نیز فتح الباری جلد ۸ دیکھنا چاہیے، یہ تمام احکام سورۂ نور میں بہ تقریب واقعۂ افک ۵ھ میں نازل ہوئے۔

۶ ؁ہجری

صلحِ حدیبیہ وبیعتِ رضوان

ذوقعدہ ۶ ؁ہجری

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں، گاؤں بھی اسی کنوئیں کے نام سے مشہور ہوگیا، چونکہ معاہدۂ صلح یہیں لکھا گیا، اس لئے اس واقعہ کو صلحِ حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخِ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آیندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا، اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی اور یہ لقب اسلام بھی ان ہی کی ایجاد ہے:

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج۔ ۷۸:۲۲) ابراہیم ہی ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

رسول اللہ ﷺ کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی، بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج۔۷۸:۲۲) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

زمانہ کے امتداد سے گو ان ہی کی اولاد بت پرست بن گئی تھی، تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا، عرب کا قبلہ گاہِ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثۂ آبائی سمجھتا تھا، نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا، عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں کیوں کہ ان کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی، تاہم چار مہینے تک جو اشہرِ حرم کہلاتے

تھے، تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، قبائلِ عرب دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے، وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا، اب یک جا جمع نظر آتے تھے اور شیر و شکر ہو کر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں، مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے، لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے، جس قدر اور قبائل کا ہے، اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گونا گوں تعلقات تھے، وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا، مکہ کی یاد ایک پھانس تھی، جو ہر وقت ان کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی، حضرت بلالؓ مکہ میں اس قدر ستائے گئے تھے، تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا، تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے(۱)۔

الالیت شعری هل أبیتنّ لیلة	آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں ایک
بواد وحولی اذخر وجلیل	رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور جلیل ہوں اور کیا وہ
وهل اردن یوما میاه مجنة	دن بھی ہوگا کہ میں مجنہ کے چشموں پر اتروں اور شامہ و طفیل
وهل یبدون لی شامة و طفیل	مجھ کو دکھائی دیں۔

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے، لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائضِ چہارگانہ میں حجِ کعبہ ایک رکنِ اعظم ہے، غرض مختلف اسباب سے آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، عمرہ (۲) کا احرام باندھا، اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے، یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے، مقام ذوالحلیفۃ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں، یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے، ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا

(۱) یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں (باب بنیان الکعبة باب مقدم النبی ﷺ واصحابه المدینة ج۱ ص ۵۵۸)"س"۔ (۲) وساق معه الهدی واحرم بالعمرة لیأمن الناس من حربه (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۰)۔

پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے، جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا، اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یک جا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی، قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا وہ جمعیتِ عظیم لے کر آئے، مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جواب تک اسلام نہیں لائے تھے، دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے، جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقامِ غمیم تک آگئے ہیں، اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو، فوجِ اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کے گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکرِ اسلام غمیم تک آ گیا، آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا، یہاں پانی کی قلت تھی، ایک کنواں تھا، وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا، لیکن اعجازِ نبویؐ سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلۂ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا، لیکن اسلام کے حلیف اور راز دار تھے، قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے، وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے، اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقاء تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت ﷺ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے، وہ آپؐ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ''ہم عمرہ (۱) کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے، ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدۂ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں، اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے'' بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ ''میں محمدؐ کے پاس

(۱) عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے، جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں، (یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں) ''س''۔

سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت دو تو کہوں" چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمدؐ کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں، لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی، بدیل نے آنحضرت ﷺ کی شرطیں پیش کیں، عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں" بولے ہاں، عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں، عروہ نے کہا "اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملہ طے کروں، محمدؐ نے معقول شرطیں پیش کی ہیں"۔ غرض آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے، قریش کا پیغام سنایا اور کہا محمدؐ فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو، اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی، حضرت ابوبکرؓ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ابوبکرؓ، عروہ نے کہا میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے، جس کا بدلا ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا۔

عروہ آنحضرت ﷺ سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریشِ مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت ﷺ کی پشت پر کھڑے تھے، اس جرأت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا "اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا"۔ عروہ نے حضرت مغیرہؓ کو پہچانا اور کہا "او دغاباز! کیا میں تیری دغابازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں"۔ (حضرت مغیرہؓ نے چند آدمی قتل کر دیئے تھے، جن کا خوں بہا عروہ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)۔

عروہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی، محمد ﷺ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے، اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے، تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں (۱)۔

[(۱) بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع اهل الحرب و کتابة الشروط مع الناس بالقول جلد ۱ ص ۳۷۸۔ ۳۷۹ "س"۔]

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا، آنحضرت ﷺ نے حضرت خراش بن امیہؓ کو قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ ﷺ کی سواری کا تھا، مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گذرنے والی تھی، لیکن قبائلِ متحدہ کے لوگوں نے بچالیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے، گو یہ سخت شرارت تھی، لیکن رحمتِ عالم ﷺ کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا، آپؐ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے(۱)۔

وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ (فتح۔۴۸ : ۲۴)	اور وہ وہی خدا ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔

بیعتِ رضوان: بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے، آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا، قریش نے ان کو نظر بند کر لیا، لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہؓ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخِ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے، سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (فتح۔۴۸ : ۱۸)	خدا مسلمانوں سے راضی تھا، جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

(۱) ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے، لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو "خطیبِ قریش" (۱) کا خطاب دیا تھا، قریش نے ان سے کہہ دیا کہ صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی، بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں، حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں "باسمک اللھم" لکھتے تھے، بسم اللہ الرحمن الرحیم سے وہ آشنا نہ تھے، اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا، آگے کا فقرہ تھا ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللہ "یعنی وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کیا"۔ سہیل نے کہا "اگر ہم آپؐ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپؐ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "گو تم تکذیب کرتے ہو، لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں" یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گذار ہو سکتا تھا، لیکن عالمِ محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں، جہاں فرماں بری سے انکار کرنا پڑتا ہے، حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپؐ کا نام نہ مٹاؤں گا، آپؐ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے، حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی، آپؐ نے "رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا (۲)۔

آنحضرت ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا، اسی بنا پر آپؐ کو امی کہتے ہیں، یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے، لکھا ہے کہ آپؐ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابنِ عبداللہ لکھا دیا، بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لئے ایک معرکۃ الآرا مباحثہ بن گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گذرتا ہے، تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا

(۱) زرقانی جلد ۲ ص ۲۲۳ "س"۔ (۲) صحیح بخاری کی اس روایت میں جو صلح حدیبیہ میں ہے، حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں، یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء (ج ۲ ص ۶۱۰) میں مذکور ہے، صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۸ باب صلح حدیبیہ میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔

ہے، اس سے امیت میں فرق نہیں آتا، بے شبہ اُمّی ہونا آپؐ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف، شرف وعزت کے موقع پر استعمال ہوتا ہے :

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ — وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں اس رسول اور نبی کی جو امی ہے۔

(اعراف ۔ ۷ : ۱۵۷)

شرائط صلح یہ تھے:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے (۱) تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائلِ عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابو جندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے، سہیل نے کہا "محمد ﷺ صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، اس (ابو جندلؓ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا"، سہیل نے کہا "تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں"، آنحضرت ﷺ نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو، سہیل نے نامنظور کیا، آپؐ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ

---

(۱) یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (کتاب الجهاد والسير صلح الحديبيه ج ۲ ص ۸۷-۸۸) میں بھی ہیں۔

ہوا، مجبوراً آنحضرت ﷺ کو تسلیم کرنا پڑا، ابوجندلؓ کو کافروں نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا، برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو، تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''ہاں ہوں'' حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں ہم حق پر ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں، آپؐ نے فرمایا ''میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا'' حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا ''لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے'' حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی، حضرت ابوبکرؓ نے کہا وہ پیغمبرِ خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں (۱)۔

حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے، بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے، لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں (۲)۔

اس حالت کا گوارا کرنا صحابہؓ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے، حضرت ابوجندلؓ بیڑیاں پہنے چودہ سو جاں نثارانِ اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلۂ قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں، اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجا انا قد عقد نابیننا و بین القوم صلحاوانا لا نغدر بھم. (۳)	ابوجندل، صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا، صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد ج اص ۳۸۰ ''س''۔ (۲) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶۔ (۳) ایضاً ص ۲۱۷۔

غرض حضرت ابوجندلؓ کو اسی طرح پا بہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں، لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا، یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے (۱) تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا، آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی، انہوں نے کہا، آپؐ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں، آپ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈوائے، اب جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔

صلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا، پھر روانہ ہوئے، تو راہ میں یہ سورہ اتری:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا (فتح۔۴۸: ۱) ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''ہاں'' صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہوگئی اور مطمئن ہوگئے (۲) نتائجِ مابعد نے اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔

اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد ورفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاق کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے، ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچتے آتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتحِ مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی

(۱) کتاب الشروط ج اص ۳۸۰ ''س''۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الجھاد والسیر باب صلح الحدیبیہ ج ۲ ص ۸۸، صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں، لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں، اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے، غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں، ہم نے ان کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

نہیں لائے تھے، حضرت خالدؓ (فاتحِ شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتحِ مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا، اس میں صرف مرد داخل تھے، عورتیں نہ تھیں، عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (ممتحنہ۔ ۶۰ : ۱۰)

مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں، تو ان کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں اور نہ کافر ان عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو، بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو، اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے، سب سے پہلے حضرت عتبہؓ بن اسید (ابو بصیر) بھاگ کر مدینہ آئے، قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ، عتبہؓ نے عرض کی کہ کیا آپؐ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں، آپؐ نے ارشاد فرمایا، ''خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا'' حضرت عتبہؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے، لیکن مقامِ ذوالحلیفہ پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، دوسرا شخص جو بچ رہا اس نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، ساتھ ہی ابو بصیر بھی پہنچے اور عرض کی کہ آپؐ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا، اب آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذومروۃ کے پاس ہے، رہنا اختیار کیا، مکہ کے بے کس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے، تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے، چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا، اس کو روک لیتے تھے، ان حملوں میں جو مالِ غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں، اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے، ہم اس سے تعرض نہ کریں گے، آپؐ نے آوارہ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ، چنانچہ ابو جندلؓ اور ان کے ساتھی مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے حضرت اُمِ کلثومؓ جو رئیسِ مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحب زادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں، مدینہ ہجرت کر کے آئیں، لیکن ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجئے، آپؐ نے منظور نہیں فرمایا، صحابہؓ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافرہ تھیں، صحابہؓ نے ان کو طلاق دے دی۔(۱)

(۱) یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس (ج۲ص ۲۳ تا ۲۵ مطبعہ وہبیہ مصر ۱۲۸۳ھ "ض") نے نقل کی ہے۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

آخر ۶ ھجری یا شروع ۷ ھجری

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (نحل۔۱۶ : ۱۲۵)

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے (ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا "ایھا الناس! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حواریینِ عیسیٰؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو(۱)" اس کے بعد آپؐ نے) قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور روسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے، ان کی تفصیل یہ ہے:(۲)

(حضرت) دحیہؓ کلبی	قیصرِ روم
(حضرت) عبداللہؓ بن حذافہ سہمی	خسرو پرویز کج کلاہِ ایران
(حضرت) حاطبؓ بن (ابی) بلتعہ	عزیزِ مصر
(حضرت) عمروؓ بن امیہ	نجاشی بادشاہِ حبش
(حضرت) سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس	روسائے یمامہ
(حضرت) شجاع بن وہب الاسدی	رئیسِ حدودِ شام، حارث غسانی

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلاد شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی، جس کا ذکر

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۲ ۔۳۹۳ و (تاریخ الخمیس بحوالہ اکتفاء کلاعی ج ۲ ص ۲۹ و ۳۰ "ض")۔

(۲) طبری (جلد ۳ صفحہ ۱۵۵۹)"س" اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ ﷺ الی الملوک ج ۲ ص ۳۹۲ اور ۳۹۳)"س"۔

قرآن مجید کی اس آیت ''غُلِبَتِ الرُّومُ'' میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سرو سامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو سخت شکست دی تھی، اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا، زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھاتے جاتے تھے ۔(۱)

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا، وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بُصریٰ تھا، جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے، اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا، دحیہ کلبی نے آنحضرت ﷺ کا نامۂ مبارک یہیں بُصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا، اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا، قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ، اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے، قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا، تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم میں سے اس مدعیِ نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا ''میں'' پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

قیصر	مدعیِ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے ۔
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں ۔
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں۔

(۱) ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری (جلد اول ص ۳۱) ''س'' شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے، اصل صحیح بخاری (باب کیف کان بدء الوحی و کتاب الجهاد باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام والنبوۃ ''س'' میں مجمل واقعہ ہے، زائد تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں ۔

قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں۔
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان	نہیں ۔
قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے، اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟
قیصر	تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟
ابوسفیان	ہاں۔
قیصر	نتیجۂ جنگ کیا رہا؟
ابوسفیان	کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔
قیصر	وہ کیا سکھاتا ہے ؟
ابوسفیان	کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں، تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے، تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے، تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں، تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے، تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو یہ ضرور خیال

تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، میں وہاں جاسکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا"۔

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھا جائے۔(۱)

فرمان رسالت کے یہ الفاظ تھے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم . من محمد عبداللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الا ریسیین و یٰٓاَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلیٰ کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ م بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران۔۳: ۶۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیسِ اعظم ہے، اس کو سلامتی ہو، جو ہدایت کا پیرو ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا، خدا تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہلِ ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی، اس سے بطارقہ اور اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا، لیکن تاج وتخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔(۲)

---

(۱) یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔(۲) مسند ابن حنبل صفحہ ۷۵ جلد ۴ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبویؐ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیئے تھے، اس نے سوالات پوچھے، آپؐ نے جوابات دیئے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہؓ کو بلایا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا، حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے۔

(جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ ص ۹۷ وزرقانی ج ۳ ص ۸۸ و ۸۹، یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک فتح مکہ کے بعد رجب ۹ ہجری میں پیش آیا ہے اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتحِ مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے، مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ کی شرکت کہیں مذکور نہیں، یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابوعبید القاسم بن سلام ص ۲۵۵ مصر میں بھی موجود ہے)"س"

خسرو پرویز (شہنشاہِ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبداللہؓ بن حذافہ لے گئے تھے، یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم . من محمد رسول الله الى كسرى عظيم فارس سلام على من اتبع الهدئ وآمن بالله ورسوله وشهد ان لآ اله الا الله وانى رسول الله الى الناس كافة لينذر من كان حيا اسلم تسلم فان ابيت فعليك اثم المجوس . (۱)

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے محمدؐ پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام سلام ہے، اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبرِ خدا پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تا کہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے، تو اسلام قبول کر، تو سلامت رہے گا، ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شوکت وشان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت وجلال حاصل ہوا، کبھی نہیں ہوا تھا، عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، نامۂ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ ﷺ کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ ''میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے'' (۲) پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، لیکن چندروز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے، ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

دران دوران کہ گیتی رامِ اوبود (۳)   زمشرق تا بہ مغرب نامِ اوبود
رسولِ ما بہ حجت ہائے قاہر   نبوت درجہاں می کرد ظاہر
گہے با سنگِ خارا رازی گفت   گہے ریگش حکایت بازی گفت
خلائق را زدعوت جام درداد   بہ ہر کشور صلائے عام درداد
بفرمود از عطا ، عطرے سرشتند   بہ نامِ ہریکے، سطرے نوشتند
چواز نامِ نجاشی باز پرداخت   زبہرِ نامِ خسرو نامۂ ساخت
چو قاصد عرضہ کرد آن نامۂ نو   بجوشید از غضب اندام خسرو

(۱) (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۱ ''ض'') ۔ (۲) (تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۴، ۳۵ ''ض'') ۔ (۳) اس سے خسرو مراد ہے۔

ز تیزی گشت ہر مویش سنانی | زگرمی ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز | نوشتہ از محمدؐ سوئے پرویز
چو عنوان گاہِ عالم تاب رادید | تو گفتی سگ گزیدہ آب رادید
غرورِ بادشاہی بردش از راہ | کہ گستاخی کہ یارد؟ با چومن شاہ
کرا زہرہ کہ با این احترام | نویسد نامِ خود بالائے نام
رخ از گرمی چو آتش گاہِ خود کرد | بخود اندیشۂ بد کرد، و بدکرد
درید آن نامۂ گردن شکن را | نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را
فرستادہ چودید آن خشم ناکی | بہ رجعت پائے خودرا کرد خاکی
ازان آتش کہ آن دودِ تہی داشت | چراغِ آگہان (۱) را آگہی داشت
زگرمی آن چراغِ گردن افراز | دعا را داد چون پروانہ پرواز
عجم رازان دعا کسریٰ در افتاد | کلاہ از تارک کسریٰ در افتاد
زہے شاہنشہے کز بیم و امید | قلم راندہ برافریدون جمشید

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعیِ نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے، باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا، ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کی کہ شاہنشاہِ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیلِ حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا، آپؐ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی (۲) یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔

نجاشی (بادشاہِ حبش) کو آپؐ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا تھا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں''۔ حضرت جعفرؓ طیار جو ہجرت

(۱) آگہان یعنی اربابِ علم، چراغِ آگہان سے ''آنحضرت ﷺ'' مراد ہیں، ''آگہی داشت'' یعنی خبر کی۔ (۲) طبری (جلد ۳ صفحہ ۱۵۷۲ تا ۱۵۷۴)۔

کر کے حبش چلے گئے تھے، یہیں موجود تھے، نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی، ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرضِ نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی (۱)۔

عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ ہجری میں وفات پائی (۲)، آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی (۳)، لیکن یہ غلط ہے، صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا (۴) (لیکن ابن قیم نے اربابِ سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑے کو راوی کا وہم بتایا ہے) (۵)۔

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، ان میں حضرت امِ حبیبہؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی بہن) بھی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ امِ حبیبہ کو شادی کا پیغام سنا دو اور میرے پاس بھیج دو، نجاشی نے خالدؓ بن سعید بن العاص کو مقرر کیا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایجاب و قبول ادا کیا، نجاشی نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے مہر ادا کیا، جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں، نکاح کے بعد حضرت امِ حبیبہؓ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کے بندرگاہ میں اتریں، آنحضرت ﷺ اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ اکثر نجاشی کے حالات حضرت امِ حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے۔ (۶)

---

(۱) طبری جلد ۳ ص ۱۵۶۹۔ (۲) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۷۲۰ ''ض''۔ (۳) (صحیح مسلم کتاب الجنائز باب فی التکبیر علی الجنازۃ ج ۱ ص ۳۵۱۔۳۵۲ ''ض'') (۴) (صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب کتاب النبی الی ملوک الکفار ج ۲ ص ۸۱ ''ض'')۔ (۵) (زاد المعاد) ''س'' (حضرت جامع سیرت سے اس موقع پر تسامح ہوا ہے، علامہ ابن قیمؒ نے بعینہٖ وہی بات کہی ہے جو مؤلفِ سیرت کا مقصود ہے ان کے الفاظ یہ ہیں وتوفی النجاشی سنه تسع و اخبر رسول الله ﷺ بموته ذالک الیوم ، فخرج بالناس الی المصلی فصلی علیه و کبر اربعا ، قلت وهذا وهم . والله اعلم . وقد خلط راویه ولم یمیز بین النجاشی الذی صلی علیه وهو الذی آمن به واکرم اصحابه وبین النجاشی الذی کتب الیه یدعوه ، فهما اثنان وقد جاء ذلک مبینا فی صحیح مسلم ان رسول الله ﷺ کتب الی النجاشی ولیس بالذی صلی علیه) زاد المعاد ج ۲ ص ٥٦ ذکر هدیه ﷺ فی مکاتباته الی الملوک وغیرهم مطبعۃ میمنیہ مصر ۱۳۲۴ء) ''ض''۔

(۶) تاریخ طبری ج ۳ صفحہ ۱۵۷۰، ۱۵۷۱ ''س''

عزیزِ مصر (مقوقس) کو آپؐ نے جو خط لکھا تھا، اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا۔

لمحمد بن عبدالله من المقوقس عظیم القبط سلام علیک اما بعد فقد قرأت کتابک وفهمت ما ذکرت فیه وما تدعوا الیه وقد علمت ان نبیا بقی وکنت اظن ان یخرج بالشام وقد اکرمت رسولک وبعثت الیک بجاریتین لهما مکان فی القبط عظیم و بکسوة واهدیت الیک بغلة لترکبها والسلام علیک. (۲)

محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے، میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں (۱) بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔

بااین ہمہ عزیزِ مصر اسلام نہیں لایا، دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرمِ نبویؐ میں داخل ہوئیں اور دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسانؓ کے ملک میں آئیں، خچر کا نام دلدل تھا، جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، جنگ حنین میں آپؐ اسی پر سوار تھے (۳)، طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطبؓ بن بلتعہ جن کو آنحضرت ﷺ نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا، ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمتِ نبویؐ میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں، (۴) اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہئے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا، نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپؐ کے حرم میں آئیں۔

(روسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے، ان کے بھی جواب مختلف آئے، ہوذہ بن علی رئیسِ یمامہ نے لکھا، تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں، اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں، اسلام ہوسِ ملک کے لئے نہیں آیا تھا آپؐ نے فرمایا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا" (۵)

---

(۱) ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی، ارباب سیرت ماریہؓ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں، لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے، یعنی کہ "مصریوں میں بڑی عزت ہے" یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ (۲) (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۷ "ض")۔ (۳) صحیح بخاری ج ۲ کتاب المغازی غزوہ حنین ص ۶۱۷ "ض") (۴) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۹۱ "ض") (۵) (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۸ "ض")

حارث غسانی جو حدود شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا، خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں (۱)۔

واقعات متفرقہ، حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص کا اسلام: (حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے، لیکن اجسام کی نہیں قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہوگیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے، قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے، فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت میں رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی، احد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں ان ہی کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ ان ہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالارِ اعظم بھی آخر اسلام کے حملۂ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رخ کیا، راستہ میں حضرت عمروؓ ابن العاص ملے، پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ حضرت عمروؓ ابن العاص نے کہا میرا بھی یہی ارادہ ہے، دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے (۲) اور اب وہ جوہر جو اسلام کے مخالفت میں صرف ہو رہا تھا، اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتحِ مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت ﷺ کے سامنے سے گذرے تو آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں، آپؐ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے"۔ (۳)

غزوۂ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زیدؓ بن حارثہ اور عبداللہؓ بن رواحہ کے بعد حضرت خالدؓ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہدِ خلافت میں ایک (خالدؓ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا (عمروؓ بن العاص) مصر کا فاتح ہوا۔

---

(۱) (اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے، ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی) "س"۔ (۲) اصابہ ابن حجر بہ روایت ابن اسحاق (جلد اول ص ۴۱۳) "س"۔ (۳) ترمذی، مناقب (ج ۲ ص ۲۲۴ مگر اس روایت میں فتح مکہ کے موقع کی تصریح نہیں ہے "ض")

۷ھ ہجری

خیبر

آخر ۶ھ ہجری یا اوائل ۷ھ ہجری

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی قلعہ کے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے، یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کئی مہینہ تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا ہے (۱) وہ نخلستان جس کے کنارہ پر خیبر ہے، نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے، جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنونضیر جلاوطن ہوکر خیبر میں آباد ہوئے، تو انہوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کردیا، جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤساء میں سے حیٔ بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحبِ اثر تھا، قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحبِ اثر قبیلہ تھا، ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور ہمیشہ سے یہودِ خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے (۲) ۶ھ ہجری میں سلام نے خود جاکر قبیلۂ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں (۳)

(۱) مارگولیتھ صفحہ ۳۵۶۔ (۲) ابن خلدون جلد ۲ ذکر قبائلِ عرب (وتاریخِ خمیس جلد ۲ ص ۴۳ باب غزوۂ خیبر) ''س''۔
(۳) ابن سعد (ج ۲ ق اول) ص ۶۶۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:

کان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان ومن حوله من مشرکی العرب و جعل لهم الحفل العظیم لحرب رسول الله ﷺ

(ابورافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی بھیڑ آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کی۔)

(صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے وکان ابو رافع یوذی رسول الله ﷺ ویعین علیه یعنی ابورافع آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپؐ کے دشمنوں کو آپؐ کے مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد واعانت کی تفصیل بہ روایت عروہ فتح الباری (جلد ۷ ص ۳۶۳) میں مفصل مذکور ہے۔

آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپؐ کے ایماء سے (رمضان ۶ ہجری میں حضرت عبداللہؓ ابن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا)، سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسندِ ریاست پر بٹھایا، اس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ ''میرے پیش روؤں نے محمد ﷺ کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں، صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد ﷺ کے دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا'' (۱) اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوجِ گراں تیار کی، آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل واقعہ کی تحقیق کریں، چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اُسیر کی زبانی اس کے مشورے اور تدبیریں سنیں، یہ حالات آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کئے، آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا، ان لوگوں نے اُسیر سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو اسلئے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے، چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر یہ مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہم رکاب چلتے تھے، جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا، قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہؓ بن انیس کی تلوار چھیننی چاہی، انہوں نے کہا او دشمنِ خدا! بدعہدی کرنی چاہتا ہے، یہ کہہ کر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آ گیا تو تلوار ماری کہ اس کی ران کٹ گئی، وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا، اب مسلمان پیش دستی کر کے یہود پر ٹوٹ پڑے، نتیجۂ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا (۲) یہ اخیر ۶ ہجری یا محرم ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا، ان لوگوں نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالم گیر جنبش پیدا کر دی، جس نے واقعۂ احزاب میں مرکزِ اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا، یہ کوشش اگرچہ

(۱) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۱۹۶ مصر) ''س''۔ (۲) یہ تمام واقعہ طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صفحہ ۶۶، ۶۷ سے منقول ہے، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی اور اُسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے، ۱۲۔

ناکام رہی، لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے۔

جن لوگوں نے جنگِ احزاب برپا کرائی تھی، ان میں زیادہ بااثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا، جو قبیلۂ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلاوطن ہو کر آیا تھا، اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا، سلام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے، اسی خاندان کا رئیس تھا، اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا۔

خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے، ادھر مدینہ کے منافقین ان کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا تھا، لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی، ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے، اسی زمانہ میں رأس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد ﷺ تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تم ان سے نہ ڈرنا، ان کی ہستی کیا ہے، مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں، یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہودہ بن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو، تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے کہ غطفان نے اس کو منظور کیا۔(۱)

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا، ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت ﷺ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے شریک ہو کر لڑیں گے، آنحضرت ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا، لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا۔(۲)

(۱) تاریخ خمیس (ج ۲ ص ۴۳، عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناظرف داری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا) ''س''۔ (۲) یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جفاء کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:

روی موسیٰ بن عقبة عن ابن شهاب قال كانت بنو فزارة ممن قدم علی اهل خيبر ليعينوهم فراسلهم رسول الله ﷺ ان لا يعينوهم وسألهم ان يخرجوا عنهم ولكم من خيبر كذا و كذا فابوا (جلد ۳ ص ۱۵۲، مصر)۔

ذی قرد محرم ۷ ہجری: غطفان کی شرکتِ جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت ﷺ کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی، (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداریِ عبدالرحمٰن بن عیینہ) چھاپا مارا اور ۲۰ اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے، حضرت ابوذرؓ کے صاحب زادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے وہاں) عیینہ بن حصن جو قبائلِ غطفان کا سپہ سالار تھا (ان کی امداد کو موجود تھا) مسلمانوں میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے، سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کی خبر معلوم ہوئی، انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جالیا، وہ اونٹنیوں کو پانی پلا رہے تھے، سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کئے حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے، دربارِ نبوت میں آ کر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں اگر ۱۰۰ آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں، آپ نے رحمتِ عام کے لحاظ سے فرمایا (۱):

ملکت فاسجح — قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو۔

اس واقعہ کے تین دن (۲) بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیازِ خاص رکھتا ہے اور اگرچہ اربابِ سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی

---

(۱) یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی مذکور ہے، لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد (ج ۲ قسم اول ص ۵۸) و ابن اسحاق سے لی گئی ہے۔

(۲) اربابِ سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن (طبری نے بہ روایتِ سلمہ (ج ۳ ص ۱۵۰۲) جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز) امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے (کتاب المغازی باب غزوۂ ذات القرد ج ۲ ص ۶۰۳) حافظ ابن حجر نے اربابِ سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے۔

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر — تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوۂ ذی قرد کے متعلق مذکور ہے وہ اربابِ سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام اربابِ سیر جس کا ذکر کرتے ہیں، وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۲ باب غزوہ ذی قرد) "س" عام اربابِ سیر کو غزوۂ خیبر (بلکہ تمام غزوات) کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں، اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں، لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

زبان سے بھی بلا قصد نکل گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپؐ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلانِ عام کر دیا کہ:

لا یخرجن معنا الا راغب فی الجهاد (۱) ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں۔

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں، یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے اور طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی، اسلام کا اصلی مقصد تبلیغِ دعوت ہے، اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدِّ راہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے، نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدۂ صلح کافی ہے، جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں، لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیرِ اثر رکھنا پڑتا ہے، خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ (۲) جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپؐ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم ۷ھ ہجری (۳) میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے، ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت ام سلمہؓ ساتھ تھیں، فوج کی تعداد ۱۶۰۰ تھی، جن میں ۲۰۰ سوار اور باقی پیدل تھے، اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلا مرتبہ تھا کہ آپؐ نے تین علم تیار کرائے، دو حضرت حبابؓ بن منذر اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت

(۱) طبقات ابن سعد ج ۲ ق اول ص ۷۷۔ (۲) یہاں "لوگ" سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مالِ غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ ان ہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آیندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں، اسی لئے حضور انور ﷺ نے اس موقع پر اعلان فرما دیا کہ اس غزوہ میں وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی و ابن سعد باب غزوہ خیبر) "س"۔ (۳) (ابن سعد جزء مغازی ج ۲ ق اول ص ۷۷ میں جمادی الاولیٰ ۷ھ ہجری ہے، جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں) "س"

ہوئے اور خاص علمِ نبویؐ جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا، جناب امیرؓ کو مرحمت ہوا، فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامر بن الاکوع (جو) مشہور شاعر تھے، یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اللھم لو لا انت ما اھتدینا	اے خدا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
ولا تصدقنا ولا صلینا	نہ خیرات کرتے ، نہ نماز پڑھتے
فاغفر فداء لک ما اتقینا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجالائے ان کو
والقین سکینۃ علینا	معاف کردے اور ہم پر تسلی نازل کر، ہم جب فریاد
انا اذا صیح بنا اتینا	میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ جاتے ہیں اور جب
وثبت الاقدام ان لا قینا	مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم
وبالصیاح عولوا علینا	سے استغاثہ چاہا ہے۔

یہ اشعار صحیح (مسلم (۱) و بخاری (۲) میں نقل کئے ہیں ،مسند ابن حنبل میں بعض اشعار (۳) زیادہ ہیں (پہلے دو مصرعے کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں (۴)۔

ان الذین قد بغوا علینا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے، جب وہ کوئی فتنہ
اذا ارادوا فتنۃ ابینا	برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے دبتے نہیں اور اے خدا ہم
ونحن عن فضلک ما استغنینا (۵)	تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کئے، چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکاتِ شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی، ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیوں کہ کسی بہرے اور دوراز نظر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو، وہ تمہارے پاس ہی ہے (۶)۔

اس غزوہ میں چند خاتونیں بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہولی تھیں، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجہ میں فرمایا "تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں"، بولیں کہ "یا رسول اللہ! ﷺ ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گے"، آنحضرت ﷺ نے فتح کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم کیا تو ان کا

---

(۱) کتاب الجہاد باب غزوۂ خیبر ج ۲ ص ۹۵ و ۹۶۔ (۲) ج ۲ ص ۶۰۳۔ (۳) ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتداء دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایت کا اختلاف ہے۔ (۴) ج ۲ ص ۹۷۔ (۵) مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۵۲۔ (۶) صحیح بخاری غزوۂ خیبر ج ۲ ص ۶۰۵۔

بھی حصہ لگایا، لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے، مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد (کتاب الجهاد باب فی المرأة و العبد یحذیان من الغنیمة ج ۲ ص ۲۷۲) میں مذکور ہے، حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں، جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگِ اُحد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گذر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدانِ جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتی اور مجاہدین کو دیتی تھیں صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے، لیکن سندِ صحیح متصل سے ذکر کیا ہے، اس لئے شک کی گنجائش نہیں، یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جاسکتی ہے۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہلِ خیبر کی مدد کو آئیں گے، آنحضرت ﷺ نے مقامِ رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسبابِ بار برداری، خیمہ و خرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں (۱) اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سج کر نکلے، لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے۔ (۲)

خیبر میں چھ قلعے تھے، سلالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربطہ اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، اسی قلعہ کا رئیس تھا (۳) ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکرِ اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہباء میں پہنچا تو نمازِ عصر کا وقت آچکا تھا، آنحضرت ﷺ نے یہاں ٹھہر کر نمازِ عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا،

(۱) یہ تفصیل معجم البلدان (ج ۴ ص ۲۲۹) ذکرِ رجیع میں ہے۔ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۵۷۵۔ اصل عبارت یہ ہے فبلغنی ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول الله ﷺ خیبر جمعوا له ثم خرجوا لیظاهروا یهود علیه حتی اذا ساروا منقلة سمعوا خلفهم فی اموالهم واهالیهم حساً ظنوا ان القوم قد خالفوا الیهم فرجعوا علی اعقابهم۔ (۳) تاریخ یعقوبی (جلد ۲ ص ۵۶)۔

وہی آپؐ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا (۱) رات ہوتے ہوتے فوجِ اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی:

انا نسئلک خیر هذه القرية وخير اهلها وخير ما فيها ونعوذبک من شرها وشر اهلها وشر مافيها (۲)

اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کا معمولِ عام تھا، یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے، تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے، چونکہ سنتِ نبویؐ یہ تھی کہ رات کو کسی مقام (۳) پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا، یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعۂ ناعم میں یک جا کیا اور فوجیں قلعۂ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم نضری بیمار تھا، تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعۂ نطاۃ میں آ کر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت ﷺ کا مقصود جنگ نہ تھا، لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی، تو آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی، تاریخِ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے:

ولما تيقن النبی ﷺ ان اليهود تحارب، وعظ اصحابه ونصحهم وحرضهم على الجهاد

اور جب آنحضرت ﷺ کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپؐ نے صحابہؓ کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔

سب سے پہلے قلعۂ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرا دیا جس کے صدمہ سے وفات پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔ (۴)

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے، لیکن قلعۂ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھیجا، لیکن دونوں ناکام واپس آئے، طبری میں روایت ہے

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۳۔ (۲) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳ (۳) صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے: اذا اتی قوما بليل لم يغزبهم حتى يصبح (باب غزوۂ خیبر ج ۲ ص ۶۰۳)۔ (۴) ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے، یہ تفصیل خمیس (ج ۲ ص ۴۶) سے لی گئی ہے۔

کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے، تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی، لیکن فوج نے ان کی نسبت خود یہی شکایت کی (۱)

اس روایت کو طبری نے جس سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں، ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے، لیکن بندار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ''وہ رافضی اور شیطان تھا'' یہ لفظ بہت سخت ہے، لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے (۲) اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے، شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں، جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں ۔ (۳)

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہؓ بھیجے گئے تھے، لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا، جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں'' (۴)، یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے، حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی، لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علیؓ میں مذکور ہے، ان کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علیؓ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی، کیوں کہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسبِ طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا اور دعا فرمائی، جب ان کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کی کہ ''کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالیں'' ارشاد ہوا کہ ''بہ نرمی ان پر اسلام کو پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے'' (۵)۔

---

(۱) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۹ ۔ (۲) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۰۹ ۔ (۳) ایضاً ص ۲۴ ۔ (۴) یہ صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۰۵) کے الفاظ ہیں۔ (۵) یہ واقعہ بہ تفصیلِ مذکور صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۰۵، ۶۰۶) میں منقول ہے ۔

لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب — خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں،
شاکی السلاح بطل مجرب — تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا، قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے، یہی خود کہلاتا تھا۔

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ — میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا،
کلیث غابات کریہ المنظرہ — میں شیر نیستاں کی طرح مہیب و بد منظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا، لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی (۱) پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں، معالم التنزیل میں ہے کہ ''حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا، لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپؐ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارۂ سنگ تھا، اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا'' (۲) یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں، لیکن بازاری قصے ہیں، علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ:

کلها واهیة (۳) — سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ''یہ روایت منکر ہے'' (۴) ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے

---

(۱) طبری جلد ۳ ص ۱۵۷۹ (یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم غزوۂ ذی القرد وغیرہ ج ۲ ص ۱۱۳ میں بھی ہیں۔)
(۲) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۷ اور طبری ج ۳ ص ۱۵۸۱ (۳) المقاصد الحسنہ ص ۹۲ مطبع علوی۔ (۴) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۱۸۔

میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں، جن کو امام بخاریؒ اور ابوداؤد اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے (۱)

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہؓ نے مارا تھا، مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے (۲) لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتحِ خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے (۳)۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہوگیا، ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں، صحابہؓ میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کرلیا گیا، لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے، یہ درخواست منظور ہوئی، بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے تھے، وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو لے لو، یہود اس عدل پر متحیر ہوکر کہتے تھے کہ ''زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں'' (۴) خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے، تقسیم کردی گئی، اسی میں آنحضرت ﷺ کا خُمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مالِ غنیمت میں سے خُمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص طور پر کرلیا جاتا تھا جس کو ''صفی'' کہتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت صفیہؓ (زوجۂ کنانہ بن الربیع) کو آپ ﷺ نے لے لیا اور آزاد کرکے ان سے نکاح کرلیا۔

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق: حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث و سیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے ان کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں، مخالفین نے اس

---

(۱) میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان ج ۱ ص ۱۴۲۔ (۲) ج ۲ ص ۱۱۵ مع شرح النووی مگر اس کو امام نووی نے مرجوح قول کی حیثیت سے نقل کیا ہے ''ض''۔ (۳) صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: فضرب براس مرحب فقتلہ ثم کان الفتح علی یدیہ ج ۲ ص ۱۱۵ ''ض'' (۴) فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۷) فتحِ خیبر و طبری ج ۳ ص ۱۵۸۹ (اصل روایت ابوداؤد کتاب البیوع باب المساقات ج ۲ ص ۴۸۴ میں موجود ہے)۔

روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ انسؓ سے منقول ہے، لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں، بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعہ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپؐ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا، آپؐ نے ان کو اپنے لئے لے لیا، اصلی الفاظ یہ ہیں:

فلما فتح الله عليه الحصن ذكر له جمال صفية بنت حيي بن اخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسا فاصطفاها النبي ﷺ لنفسه (۱)

(جب خدا نے قلعہ فتح کرادیا تو لوگوں نے آپؐ سے صفیہؓ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی، اس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے لئے پسند کرلیا۔

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب مايذكر في الفخذ) (۲) (صحیح مسلم باب فضل عتق الامة ثم التزوجها) (۳) میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا، لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ سے کہا :

يانبي الله اعطيت دحية صفية بنت حيي سيدة قريظة والنضير لا تصلح الالك .

اے پیغمبر خدا! آپؐ نے صفیہؓ کو دحیہ کے حوالہ، کیا وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپؐ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں،

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرلیا۔ ابوداؤد (۴) میں یہ دونوں روایتیں ہیں اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو اس لئے حضرت دحیہؓ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ :

لما فيه من انتها كها مع مرتبتها و كونها بنت سيدهم (۵)

چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحب زادی تھیں، اس لئے ان کا کسی اور کے پاس جانا ان کی توہین تھی۔

---

(۱) ج ۲ ص ۶۰۶۔ (۲) ج ۱ ص ۵۴۔ (۳) (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۵۴۶)۔ (۴) ابوداؤد کتاب الخراج باب ما جاء في سهم الصفي ج ۲ ص ۴۲۱۔ (۵) حاشیہ ابوداؤد ج ۲ ص ۴۲۱۔

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیسِ خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاسِ خاطر، حفظِ مراتب اور رفع غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا، (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں، یا آپؐ کے نکاح میں آنا قبول کریں، انہوں نے دوسری صورت پسند کی، یعنی یہ کہ وہ آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آجائیں) (۱) حسنِ خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرزِ عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گذر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند روز خیبر میں قیام کیا، اگرچہ یہود کو کامل امن وامان دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی، تاہم ان کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا، پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی، آنحضرت ﷺ کی چند صحابہؓ کے ساتھ دعوت کی، آپؐ نے فرطِ کرم سے قبول فرمایا، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپؐ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا، لیکن حضرت بشرؓ بن براءؓ نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا "ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپؐ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی" (۲)

آنحضرت ﷺ کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، اس بنا پر آپؐ

(۱) مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۸ مصر) "س" ۔ (۲) مسند احمد ج ۲ ص ۴۵۱ و تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۸۳۔۱۵۸۴

نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا، لیکن جب دو تین دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی (۱)۔

ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن سہلؓ اور حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے، یہود نے حضرت عبداللہؓ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا، حضرت محیصہؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کیا، آپؐ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ (۲) حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھالیں گے، غرض آنحضرت ﷺ نے یہود سے تعرض نہ کیا اور بیت المال سے مقتول کا خوں بہا دلا دیا۔ (۳)

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا، اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے، مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلا وطن کر دیا (۴) (یہ جملۂ معترضہ سلسلۂ کلام میں آ گیا تھا)۔

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہوگئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امنِ عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے، لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہوگئی (۵) بالآخر آپؐ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لئے گئے۔ (۶)

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے:

---

(۱) زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۸۔ (۲) (مسلم میں ہے "آپ نے فرمایا کہ تم پچاس قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ انہوں نے تامل ظاہر کیا، فرمایا کہ اگر یہود پچاس قسم کھالیں تو عرض کی کہ) "ض" (۳) صحیح بخاری کتاب الاحکام باب کتاب الحاکم الی عمالہ ج ۲ ص ۱۰۶۷ و صحیح مسلم کتاب القسامۃ ج ۲ ص ۳۱، ۳۲۔ (۴) فتوح البلدان بلاذری (ص ۳۱ مطبعہ موسوعات مصر ۱۳۱۹ھ) اور صحیح بخاری مطبوعہ مصطفائی، جلد اول ص ۳۷۷ (کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک)۔ (۵) یہ پوری تفصیل تاریخ طبری (ج ۳ ص ۱۵۸۲) میں مذکور ہے، ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے۔ (۶) فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۴) لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

ثم دفعه رسول الله الی محمد بن مسلمة فضرب عنقه باخیه محمود بن مسلمة(۱)

پھر آنحضرت ﷺ نے کنانہ کو محمدؓ بن مسلمہ کے حوالہ کیا، انہوں نے اپنے بھائی محمودؓ بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے، لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازیِ نبویؐ کے واقعات روایت کرتے تھے (۲) اس روایت کو بھی ان ہی روایتوں میں سمجھنا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمۃ للعالمینؐ کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ (یہودِ خیبر اور) کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (۳) (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو قتل کا مستحق ہوگا۔ (۴)

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا، ٹوٹ گیا، کنانہ نے محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا،

---

(۱) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۸۲ وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۹۔ (۲) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۱، ابن اسحاق کی منقطع روایتوں کو محدثین نے بھی منکر قرار دیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے وهو صالح الحديث ما له عندى ذنب الا ماقد حشا فى السيرة من الاشياء المنكرة المنقطعة۔ "ض"۔ (۳) ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب حکم ارض خیبر ج ۲ ص ۲۲۴۔ (۴) طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ج ۲ ق اول ص ۸۱ سطر ۲۴۔

محمودؓ بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا، اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا، اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے، اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے، یعنی دونوں قتل کئے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبیٰ اهلیهما (۱) — تو آنحضرت ﷺ نے دونوں کو قتل کر دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا۔

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی، لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنا لئے گئے۔

فلمّا وجد المال الذی غیبوه فی مسک الجمل سبی نسآء هم (۲) — تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انہوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں۔

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصولِ تنقید سے جانچی جاتی ہیں، تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے، یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف، خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھا۔

صحیح بخاری میں ہے:

فلمّا اجمع عمر علی ذلک اتاه احدبنی ابی الحقیق فقال یا امیر المؤمنین اتخر جنا وقد اقرنا محمد وعاملنا علی الاموال (۳)۔ — پھر جب حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابوالحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین آپ ہم کو نکالتے ہیں، حالانکہ ہم کو محمد ﷺ نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا (۴)۔

حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا ہے:

ولم یقتل رسول الله ﷺ بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق (۵) — آنحضرت ﷺ نے صلح کے بعد ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارتِ مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

---

(۱) طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ص ۸۱ سطر ۲۷ (۲) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم اول غزوۂ خیبر ص ۸۰ سطر ۵۔
(۳) صحیح بخاری جلد اول مطبع مصطفائی ص ۳۷۷، باب اذا اشترط فی المزارعة اذا شئت اخرجتک
(۴) فتح الباری ج ۵ ص ۲۴۰۔ (۵) زاد المعاد ج اول ص ۳۹۵۔

ابوداؤد میں جہاں ارضِ خیبر کا عنوان باندھا ہے صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے، یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ابوداؤد نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سعیہ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہوگیا، باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا(۱) یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمودؓ بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا، ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے، اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہوگئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ: اس قدر عموماً مسلم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا، یعنی آنحضرت ﷺ جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں، محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، بہت سے فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی، لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہوگیا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کے رو سے تھا:

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (بقرہ۔۲:۲۱۷) — کہہ دو کہ اس مہینہ میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا ہے۔

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ (مائدہ۔۵ : ۲) — مسلمانو! خدا کی حدبندیوں کی اور ماہ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی، اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا، اب وہ کون سی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

وليس فى كتاب الله ولا سنة رسوله ناسخ لحكمها — اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتحِ حرم، طائف کا محاصرہ، بیعتِ رضوان، یہ سب ماہِ حرام میں ہوئے تھے، اس لئے اگر ماہِ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ ان کو کیوں کر

(۱) ابوداؤد کتاب الخراج باب فی حکم ارض خیبر ج۲ ص۲۶۔

جائز رکھتے، حافظ ابن القیمؒ نے جواب دیا ہے کہ ماہِ حرام میں ابتداً جنگ کرنا حرام ہے، لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے، وہ سب واقعات دفاعی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی، بلکہ دفاع کیا گیا تھا، بیعتِ رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا، طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی، بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا، جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے، فتحِ حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا، جس کی ابتدا قریش نے کی تھی (۱)۔

حافظ ابن القیمؒ نے نہایت صحیح جواب دیا، لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامنفصل رہ گئی، حافظ ابن القیمؒ کے استاد علامۂ ابن تیمیہؒ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انہوں نے الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں، سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اگر علامۂ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں، بدر کا بیان اوپر گذر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیمِ زمین: خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، کل فوج کی تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) تھی دو سو (۲۰۰) سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا، اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو (۱۸۰۰) کے برابر تھی، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا:

ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل سھم واحد ھم (۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔

ملکی حالت اور احکامِ فقہی: خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا

---

(۱) زاد المعاد ذکر غزوۂ خیبر ج ۱ ص ۴۰۰۔ (۲) فتوح البلدان بلاذری ذکر غزوۂ خیبر (ابوداؤد کتاب الخراج والفئی ج ۲ ص ۴۲۶ حکم ارض خیبر میں ہے، النبی صلی اللہ علیہ وسلم معھم لہ سھم کسھم احدھم) "س"

ہے، اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے، مشرکین اور یہود، عیسائی اگرچہ عرب میں موجود تھے، لیکن وہ کچھ زور اور اثر نہیں رکھتے تھے، مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے، لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا، مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت ﷺ کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفسِ واحدۃٍ ہوگئے، خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا، اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادات کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا، شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے، حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی، خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی، ادھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔

اربابِ سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل ہوئے (۱) اور آنحضرت ﷺ نے ان کی تبلیغ کی، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ پنجہ دار پرند حرام ہو گئے۔

۲۔ درندہ جانور حرام کر دیئے گئے۔

۳۔ گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

۴۔ اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک، ورنہ تین مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔

۵۔ چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا۔

۶۔ بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک: تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے، جس میں بہت سی بستیاں آباد تھیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں، قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے، یاقوت نے

(۱) یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد وثمود کے آثارات اب بھی باقی ہیں، اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آکر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہ یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔(۱)

خیبر کے بعد آنحضرت ﷺ نے وادی القریٰ کا رخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیراندازی شروع کردی، آنحضرت ﷺ کا محمل آپ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اتار رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے، عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے :

وقد استقبلتنا یهود بالرمی ولم نكن على تعبية (۲) — یہود ہمارے مقابلہ کو تیر کو چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔

بہرحال جنگ شروع ہوگئی، لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہوگئی۔

ادائے عمرہ: صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت ﷺ مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرادیا کہ جو لوگ واقعۂ حدیبیہ میں شریک تھے، ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔

معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحۂ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے، چھوڑ دیئے گئے اور دو سو (۲۰۰) سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کردیا گیا۔

آنحضرت ﷺ لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے(۳):

خلوا بنی الكفار عن سبيله — کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ

اليوم نضربكم على تنزيله — آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔

---

(۱) معجم البلدان لفظ قریٰ (جلد ۷ ص ۴۳)"س"۔(۲) زرقانی بر موطا بہ حوالہ بیہقی باب الجهاد ذكر غلول (ص ۳۱۳) "س" (۳) یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل (باب صفة كلام رسول الله ﷺ في الشعر ص ۱۹۹) میں نقل کیا ہے۔

ضربا یزیل الھام عن مقیلہ — وہ وار جو سر کو خواب گاہ سر سے الگ کردے۔
ویذھل الخلیل عن خلیلہ — اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلادے۔

صحابہؓ کا جم غفیر ساتھ تھا اور برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرضِ مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کررہا تھا، اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب وہوا نے کمزور کردیا ہے، اس بنا پر آپؐ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں، عربی زبان میں اس کو ''رمل'' کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار وناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی، تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی تھیں، رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کردیا اور پہاڑوں پر چلے گئے، تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا ''محمدؐ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہوچکی اب مکہ سے نکل جائیں''۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی، آپؐ اسی وقت روانہ ہوگئے، چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن صاحب زادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت ﷺ کے پاس ''چچا چچا'' کہتی دوڑی آئیں (۱) حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھالیا، لیکن حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) اور زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دعوے پیش کئے، حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے، اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماءؓ کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ ''خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے'' (۲)

☆

---

(۱) آنحضرت ﷺ رشتہ میں ان کے بھائی تھے، لیکن انہوں نے تعظیماً کہا (یا اس لئے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت حمزہ دونوں رضاعی بھائی تھے)۔ (۲) اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری (کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء ج ۲ ص ۶۱۰) سے ماخوذ ہے، بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں، جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

۸ھ ہجری غزوۂ موتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ ہجری

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے، جو بلقاء سے، اس طرف ہے، عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں، وہ یہیں بنتی تھیں (۱) کُثیر مشہور شاعر کہتا ہے:

صوارم یجلوها بموتة صیقل (وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ بصریٰ یا قیصرِ روم کے نام ایک خط لکھا تھا، عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمراں تھے، ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا، جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا، یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمراں تھا، یہ خط حارثؓ بن عمیر لے کر گئے تھے، شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا، اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی، زید بن حارثہؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولتِ شہادت نصیب ہو تو جعفرؓ طیار اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں (۲) حضرت زیدؓ غلام تھے، گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفرؓ طیار حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربِ خاص تھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے، چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے (۳) لیکن اسلام جس مساواتِ عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا، اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا، حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا،

(۱) معجم البلدان لفظ موتہ (ج ۸ ص ۱۹۰)۔ (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ موتہ ج ۲ ص ۶۱۱۔ (۳) (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۹۳) ''س''۔

آنحضرت ﷺ نے ان ہی زیدؓ کے صاحب زادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا، اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے، آنحضرت ﷺ نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ ''تم لوگوں نے ان کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا، حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے'' چنانچہ صحیح بخاری (بعث النبی ﷺ اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ، باب المغازی) میں یہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔

گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغِ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوتِ اسلام دی جائے، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ بھی حکم ہوا کہ اظہارِ ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارثؓ بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت ﷺ خود فوج کی مشایعت کے لئے تشریف لے گئے، صحابہؓ نے پکار کر دعا کی کہ خدا اسلامت اور کامیاب لائے۔(۱)

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی، جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی، ادھر خود قیصرِ روم (ہرقل) قبائلِ عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا، جو بلقاء کے اضلاع میں ہے، حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربارِ رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے، لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولتِ شہادت ہے(۲)، جو ہر وقت حاصل ہوسکتی ہے، غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا، حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں، پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے، حضرت عبداللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھوں کے نوے (سے زائد) زخم تھے(۳) لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا، حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے،

(۱) طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۹۳) ''س'' (۲) (ابن ہشام غزوۂ موتہ ج ۲ ص ۲۵۲)۔(۳) صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۱ غزوۂ موتہ۔

اب حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے، صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں (۱) لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا مقابلہ تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچالائے، جب یہ شکست خوردہ (۲) فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہلِ شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ اوفراریو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا، حضرت جعفرؓ سے آپ کو خاص محبت تھی، ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا، آپ مسجد میں جا کر غم زدہ بیٹھے، اسی حالت میں ایک شخص نے آ کر کہا کہ جعفر کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے اور واپس آ کر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تو ان کے منہ میں خاک بھر دو"، یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔ (۳)

❖☆❖

(۱) (صحیح بخاری غزوۂ موتہ) "س" (۲) (مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے، لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوۂ موتہ میں ہے کہ حضور انور ﷺ نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا، (فتح اللہ علیھم) ارباب سیر اور اہلِ روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں، ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی، دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے، تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس سے مالِ غنیمت بھی حاصل کیا، چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا اور بہ سلامت پیچھے ہٹ آئے، اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہئے، اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور انور ﷺ نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا، تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری و روض الانف سہیلی والبدایہ ابن کثیر باب غزوۂ موتہ) "س"۔ (۳) صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۱۔

فتح مکہ

رمضان ۸؍ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا (فتح۔ ۴۸ : ۱)

جانشینِ ابراہیم (علیھما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیاء اور حرمِ کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفتِ عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا، صلحِ حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن وامان قائم ہوگیا اور دلدادگانِ حرم ایک دفعہ یادگارِ ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، حلم وعفو وتحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آگیا کہ آفتابِ حق حجاب ہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلحِ حدیبیہ کی بنا پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرت ﷺ کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنوبکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں، اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں کیوں کہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلحِ حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا، تو بنوبکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا، دفعتاً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر (۱) بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنوبکر رک گئے

(۱) طبری صفحہ ۱۲۶۰۔ (ج ۳) (ابن سعد، جزء مغازی ص ۹۷ میں کچھ اور نام بھی ہیں) ''س''۔

کہ حرم کا احترام ضرور ہے، لیکن ان کے رئیسِ اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا، غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، کہ دفعتاً یہ صدا بلند ہوئی:

لاهم انی ناشد محمدا	اے خدا! میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا، جو ہمارے
حلف ابینا وابیه الاتلدا	اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے، اے پیغمبر خدا!
فانصر رسول الله نصرا عتدا	ہماری اعانت کر اور خدا کے بندوں کو بلا، سب اعانت
وادع عباد الله یاتوا مددا	کے لئے حاضر ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار (۱) جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے واقعات سنے تو آپؐ کو سخت رنج ہوا، تاہم آپؐ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

۱۔ مقتولوں کا خوں بہادیا جائے۔

۲۔ قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳۔ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمرو نے قریش کی زبان سے کہا کہ ''صرف تیسری شرط منظور ہے'' (۲) لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی، انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں، ابوسفیان نے مدینہ آکر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہِ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہؓ زہرا کے پاس آیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا''۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا ''بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل'' بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجد نبویؐ میں جا کر اعلان کر دیا کہ ''میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی'' (۳)۔

(۱) (طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۹۷) ''س''۔ (۲) زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے، تعجب ہے کہ اور مورخین اور اربابِ سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ (۳) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۷)

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہلِ مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے، انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی، حضرت علیؓ (اور حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی) کو بھیجا (۱) کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ ''حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں''؟ لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی، ارشاد ہوا، عمر! تم کو کیا معلوم ہے، ممکن ہے کہ خدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا، اس لئے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو کوکبۂ نبویؐ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائلِ عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے، مرالظہر ان پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا، اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی، جس سے تمام صحرا وادیِ ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لئے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمۂ نبویؐ کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا، اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا (۲)، حضرت عمرؓ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی

---

(۱) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۹) ''س''۔ (۲) اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں، میں نے ان کو بھی لے لیا ہے، بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔

سے آگے بڑھے اور بارگاہِ رسالت میں آ کر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا، لیکن حضرت عباسؓ نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا، حضرت عباسؓ نے کہا ''عمرؓ! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے'' حضرت عمرؓ نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں، آپ جس دن اسلام لائے تھے، مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی (۱)

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی، اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائلِ عرب کا اشتعال، آنحضرت ﷺ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفوِ نبویؐ) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ ''خوف کا مقام نہیں''۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا (۲) لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:

رسول اللہ ﷺ	کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟
ابوسفیان	کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔
رسول اللہ ﷺ	کیا اس میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟۔
ابوسفیان	اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

بہر حال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے، چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکرِ اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواجِ الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں، کچھ

---

(۱) (طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲) ''س'' (۲) بخاری ج ۲ ص ۶۱۳۔

دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں، سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ (سعد بن) ہذیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون ہے؟ حضرت عباسؓ نے نام بتایا، دفعتاً سردارِ فوج حضرت سعد بن عبادہؓ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گذرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے:

الیوم یوم الملحمة	آج گھمسان کا دن ہے،
الیوم تستحل الکعبة	آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبویؐ نمایاں ہوا، جس کے پرتو سے سطحِ خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا، حضرت زبیرؓ بن العوام علم بردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمالِ مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ "حضور ﷺ نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے"؟ ارشاد ہوا کہ "عبادہ نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے" (۱) یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے (۲)۔

مکہ پہنچ کر آپؐ نے حکم دیا کہ علمِ نبویؐ مقامِ حجون پر نصب کیا جائے، حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف (سے) آئیں (۳)۔

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا، یا دروازہ بند کر لے گا (یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا) اس کو امن دیا جائے گا، تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب یعنی حضرت کرزؓ بن جابر فہری اور حضرت حبیشؓ بن اشعر (۴) اور حضرت سلمہؓ بن المیلا نے شہادت پائی، (۵) حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا، یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، آنحضرت ﷺ نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے بازپرس کی، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی" (۶)۔

---

(۱) یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے (۲) ابن سعد جزء مغازی ص ۹۸۔ (۳) (مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے، صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں، ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالدؓ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور ﷺ بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، فتح الباری ج ۸ ص ۸) "س" (۴) ان (دونوں بزرگوں) کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔ (۵) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۱ (۶) ابن سعد جزء مغازی ص ۹۸۔

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا، ابوطالب (آنحضرت ﷺ کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحب زادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں؟ (۱) اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا"، جہاں قریش نے (ہمارے خلاف) کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا۔

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا، اس کے آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے، آنحضرت ﷺ ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۷ : ۸۱) (۲)
حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے، جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں (۳) حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں، وہ بھی مٹادیں (۴) حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا، آپؐ حضرت بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی، بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبۂ فتح: شاہنشاہیٔ اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہِ احدیت کی

---

(۱) (صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہؓ بن زید سے جو روایت ہے، اس میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا، لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں، لیکن جو روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے، ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، فتح الباری ج ۸ ص ۱۳ و جلد ۲ ص ۳۶۰)"س"۔ (۲) (اس موقع پر اس پوری آیت پاک کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ (ص ۹۹) میں ہے، صحیح بخاری فتح مکہ میں الفاظ آئے ہیں جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ۔ یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا) (ج ۲ ص ۶۱۴)"س"۔ (۳) صحیح بخاری فتح مکہ (۴) ابن سعد جزء مغازی ص ۱۰۲۔

تقریر خلافتِ الٰہی کے منصب سے رسول اللہ ﷺ نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں، بلکہ تمام عالم سے تھا۔

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَـهٗ صدق وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده الا كل مـأثرة اودم اومال يدعىٰ فهو تحت قدمى هاتين الا سدانة البيت وسقاية الحاجّ .... يـا معشـر قـريـش ان اللـه قد اذهب عنكم نـخـوة الجاهلية وتعظمها با لأبآء الناس من آدم و آدم من تراب

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر، تمام انتقاماتِ خوں ہائے قدیم، تمام خوں بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں، .... اے قومِ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی (۱) جو مع ترجمہ حسب ذیل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔
(حجرات ۔۴۹ : ۱۳)

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ، لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے۔

(بخاری میں ہے کہ اس موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا۔)

ان الله ورسوله حرم بيع الخمر (۲)

خدا (اور اس کے رسول) نے شراب کی خرید وفروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوتِ اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب: عرب میں دستور تھا، کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آ سکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھ جاتا اور سیکڑوں برس گذرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہے تو اس کے خاندان یا قبیلہ کے آدمی کو قتل کرتے تھے، اسی طرح خوں بہا کا مطالبہ بھی ابًا عن جدٍ چلا آتا تھا، یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی، اس طرح اور اور بہت سی لغو

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۳۔ (۲) ج ۲ ص ۶۱۵۔

باتیں مفاخرِ قومی میں داخل ہوگئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس بنا پر آپؐ نے (اس طریق) انتقام اور خوں بہا اور نیز اور تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ ''میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا''۔

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرقِ مراتب قائم کئے گئے تھے، جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا، جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بندش کردی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔

اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساواتِ عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب و عجم، شریف و رذیل، شاہ و گدا سب برابر ہیں، ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ ''تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے''۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسیؐ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا، ''تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟''۔

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ:

اخ کریم و ابن اخ کریم — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے۔

ارشاد ہوا:

لا تثریب علیکم الیوم . اذھبوا فانتم الطلقاء (۱)
تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کرلیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے، ان کی آتشِ غیرت پھر مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا "خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھالیا" (۲)۔ ایک سردارِ قریش نے کہا "اب جینا بےکار ہے" (۳)۔

مقامِ صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے، آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت ﷺ دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے (۴) آپؐ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی، یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی، حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی، وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں، لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے) باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں: (۵)۔

رسول اللہ ﷺ	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	یہ اقرار آپؐ نے مردوں سے تو نہیں لیا، لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ ﷺ	چوری نہ کرنا۔

(۱) زرقانی ج ۲ ص ۳۹۱۔ (۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۴۲۷ (حضرت عتاب بعد کو مسلمان ہوئے) "س" (۳) اصابہ تذکرۂ عتاب بن اسید (ج ۲ ص ۴۵۱) "س" (۴) (طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۴) "س" (۵) (ایضاً ص ۱۶۴۳ مختصراً) "س"۔

ہند	میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔
رسول اللہ ﷺ	اولاد کو قتل نہ کرنا ۔
ہند	ربینا هم صغارا وقتلتهم كبارا فانت وهم اعلم ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا بڑے ہوئے تو جنگ بدر (۱) میں آپؐ نے ان کو مار ڈالا، اب آپؐ اور وہ باہم سمجھ لیں ۔

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ رئیسِ عرب مکہ سے جلاوطن ہوا جاتا ہے، آپؐ نے علامتِ امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے، حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے (۲) (بعد کو مسلمان ہو گئے)۔

عبداللہ بن زبعریٰ عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت ﷺ کی ہجویں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے، لیکن پھر آ کر اسلام لائے۔ (۳)

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے، لیکن ان کی حرم (ام حکیمؓ) نے آنحضرت ﷺ سے امان لی اور جا کر یمن سے لائیں (۴) یہ واقعہ ابوجہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آ گیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں۔

اشتہاریانِ قتل: اربابِ سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گو اہلِ مکہ کو امن عطا کیا تھا، تاہم دس شخصوں (۵) کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ ابن خطل مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے، لیکن متعدد ایسے تھے کہ

(۱) جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے تھے اور لڑ کر مارے گئے تھے (۲) طبری (ج ۳ ص ۱۶۴۵) ''س'' و اصابہ ذکر صفوان بن امیہ (ج۲ ص ۱۸۷) ''س'' (۳) (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۷) ''س'' (۴) (طبری ج ۳ ص ۱۶۴۶) ''س'' (۵) (حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں۔ (بقیہ ص ۳۷۲ پر)

ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے، یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کردی گئی کہ وہ آپ ؐ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفارِ قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ بایں ہمہ ان ہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے، وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے، حضرت عائشہ ؓ صدیقہ کی یہ روایت صحاحِ ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ ؐ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا، ارشاد ہوا کہ نہیں، خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم ﷺ کے طفیل سے جاں بر ہو سکتی ہے، تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفوِ نبوی ؐ سے کیوں کر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابلِ اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے (۱) اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا، مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا، باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۱) جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاطانہ ہیں، عام اربابِ سیرت نے دس شخصوں کے نام لئے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں ابوداؤد اور دار قطنی کی روایت میں صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

عام روایت کے رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا، ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے، تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار شخص قتل ہوئے، تین مرد اور ایک عورت، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقید اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے جو اسلام لاچکا تھا، اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کی دیت ادا کردی تھی تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا اور حویرث نے آنحضرت ﷺ کی دو صاحب زادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرا دینا چاہتا تھا۔ حضرت علی ؓ بن ابی طالب نے اس کو قتل کر دیا۔

قریبہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکہ کی ایک مغنیہ تھی، جو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی (دیکھو زرقانی (ج ۲ ص ۳۶۱ تا ۳۶۴) اور ابن ہشام ذکر فتح مکہ ج ۲ ص ۲۷۲)۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۳ پر

ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے جو قابلِ اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہٖ جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارہ میں پیش کی جاسکتی ہے وہ ابوداؤد کی روایت ہے (۱) جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتحِ مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا، لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہئے مجھ کو نہیں ملی (۲)، پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے، (اور شروع میں جو روایت ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۲) (بخاری فتح مکہ ج ۲ ص ۶۱۴) ''س'' (۱) ابوداؤد کتاب الجہاد ج ۲ ص ۹ مطبعہ قادری۔

(۲) ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں، پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے، یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے، جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور ﷺ کی رضا کے بغیر آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا، اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں اور خصوصاً اسباط بن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتد میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے، اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے، ابوداؤد کی دوسری روایت عمروؓ بن عثمان بن عبدالرحمٰن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی، ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں، ایک مسلمان ہوگئی اور ایک قتل کی گئی، اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابوالعلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی راویت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب الحج میں ہے، اس میں سند کے آخر میں یوں ہے، عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی، اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے، ابوداؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری وغیرہ کی روایت سے بھی ثابت ہے، بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے ایک روایت کی ہے، جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار شخصوں کے قتل کا حکم ہے، تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا، عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جاں بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتحِ مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے کر چلی تھی، اس روایت میں حکم بن عبدالملک متفقاً نا قابلِ اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کی نسبت عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تائید اس کے رفقاء میں سے کسی نے نہیں کی ہے، تہذیب ابن حجر ج ۲ ص ۴۳۱۔ ۴۳۲) ''س''

اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے، جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے، جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ ''قوی نہیں ہے'' اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں، لیکن واقعہ جس درجہ اہم ہے، اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ بعض سردارانِ قریش جو مخالفین اسلام کے پیش رو تھے، آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے، لیکن یہ صرف ابنِ اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے، جو ابوجہل کے فرزند تھے، لیکن موطائے امام مالکؒ میں جس کی نسبت امام شافعیؒ کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں، یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

''حارث بن ہشام کی صاحب زادی، ام حکیم، عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں، لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، پھر ان سے بیعت لی (۱)''۔

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور سے لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا، وہ اسلام پر مجبور نہیں کئے جاتے تھے، تمام مورخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتحِ مکہ کے بعد پیش آئی لشکرِ اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے، جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں ان ہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے (۲)۔

خزائن حرم: حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا، وہ

---

(۱) مؤطا امام مالک کتاب النکاح باب نکاح المشرک اذا اسلمت زوجته قبله ص ۱۹۸۔ (۲) مصنفؒ کی یہ تحقیق عام اور مشہور روایت کے برعکس ہے، مورخین کی تصریح یہ ہے کہ مکہ کے جو لوگ حنین کے موقع پر لشکرِ اسلام میں شامل ہوئے تھے وہ مسلم تھے البتہ ابھی ان میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی ''ض''۔

محفوظ رکھا گیا، لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کردی گئیں، ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی (۱) جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہوگیا تھا، رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی تعمیر تک باقی رہے (۲)

مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی: فتحِ مکہ کا اصلی مقصد اشاعتِ توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سیکڑوں بت تھے، جن میں ہبل بھی تھا جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا اور یاقوتِ احمر سے بنا تھا، سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لاکر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پرپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے، جن پر ''لا'' و ''نعم'' لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور ''ہاں'' یا ''ناں'' جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے (۳)، جنگِ احد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی، وہ عین کعبہ کے اندر تھا، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کردیا گیا۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے، جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزیٰ تھے، عزیٰ قریش کا اور لات اہلِ طائف کا معبود تھا، مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھا، بنوشیبان اس کے متولی تھے، اہل عرب کا اعتقاد تھا کہ خدا جاڑوں میں ''لات'' کے ہاں اور گرمیوں میں ''عزیٰ'' کے ہاں بسر کرتا ہے، عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے (۴)

مناۃ کا تخت گاہ مشلّل تھا جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے، وہ ایک

---

(۱) فتح الباری ذکر فتحِ مکہ۔ (۲) فتح الباری ذکر فتح مکہ (اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں) (۳) معجم البلدان ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی۔ (۴) یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم صفحہ ۴۰۰ میں ہے۔

بن گھڑا پتھر تھا، ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کیے تھے، یہ ان سب میں بالاتر تھا، اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آ کر ادا کرتے تھے۔(۱)

قبیلہ ہذیل کا بت سواع تھا، جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنولحیان تھے۔

بت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے، جن میں سارا عرب گرفتار تھا، اب ان کی بربادی کا وقت آ چکا تھا اور دفعتاً ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

---

(۱) معجم البلدان ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین واوطاس وطائف

شوال ۸ھ ہجری

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (توبہ۔۹ : ۲۵)

حنین: حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے، ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے (۱) یہ اس کے دامن میں ہے، اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں (۲) ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے، ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ اگر قریش پر غالب آ گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا (۳) لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا، یہ قبیلے نہایت جنگ جو اور فنونِ جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے (۴) کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے، اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن (اور ثقیف) کے رؤسا نے (یہ سمجھ لیا

---

(۱) (یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے، جو عرفہ سے تین میل ہے، ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن سفر کی مسافت پر واقع ہے)''س'' (۲) (قاضی عیاض کی یہی رائے ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے، فتح الباری وزرقانی ذکر غزوۂ ہوازن واوطاس) ''س''۔(۳) صحیح بخاری ذکر فتح مکہ (بعد) باب مقام النبیؐ بمکۃ ۔(۴) مارگولیتھ صاحب لکھتے ہیں ''حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔

کہ اب ان کی باری ہے، اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور آپس میں) قرار داد ہوگئی کہ (مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں) ایک عام حملہ کر دیا جائے۔

(اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل) بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنے تمام اہل وعیال کو لے کر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں، تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، فوج کی سرداری کے لئے انتخاب (تو) مالک بن عوف (۱) (کیا گیا جو) قبیلۂ ہوازن کا رئیس اعظم تھا (لیکن مشیر کی حیثیت سے) دُرید بن الصمہؔ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلہ جُشم کا سردار تھا، اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں، لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، تاہم چونکہ عرب اس کو مانتا تھا اور اس کی رائے وتدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی، پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدانِ جنگ میں لائے، اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے، لوگوں نے کہا ''اوطاس'' بولا کہ ''ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے، نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں''۔ پھر پوچھا کہ ''یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں''؟ لوگوں نے کہا کہ ''بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے'' بولا کہ ''جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی، میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے، بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی''۔

پھر پوچھا کہ ''کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں'' اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدانِ جنگ میں نہیں تو کہا ''اگر آج کا دن عزت وشرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے'' اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلانِ جنگ کیا جائے، لیکن مالک بن عوف نے جو سی سالہ نوجوان تھا، جوشِ

(۱) (مالک بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے، زرقانی ج ۳ ص ۶) ''س''۔

شباب میں اس رائے کے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی۔(۱)

رسول اللہ ﷺ کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپؐ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہؓ بن ابی جدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے، آنحضرت ﷺ نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامانِ جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی، عبداللہ بن ربیعہ جو ابوجہل کے بے مات بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس ہزار درہم قرض لئے، (۲) صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیسِ اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت ﷺ نے اسلحۂ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے۔(۳)

شوال ۸ھ ہجری مطابق جنوری وفروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سروسامان سے حنین پر بڑھیں کہ (بعض) صحابہؓ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ ''آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے''، لیکن بارگاہِ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ	اور حنین کا دن یاد کرو، جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے،
عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا	لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگی
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ. ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ	کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے
سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَنْزَلَ	رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں
جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ	جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی
جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ. (توبہ۔۹: ۲۶،۲۵)	یہی سزا ہے۔

(۱) یہ تمام تفصیل طبری میں ہے، (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷) ''س'' (۲) مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۶، اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے، لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے۔ (۳) موطا میں ہے کہ جب آپؐ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپؐ نے فرمایا جبراً نہیں طوعاً (ابوداؤد باب الضمانہ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے)

فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا، رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا (۱)، حضرت ابوقتادہؓ جو شریک جنگ تھے۔

(۱) لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے، ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی (مصنف نے آیندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے، اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل تشریح ہیں:

۱۔ پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے، لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی، جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی، بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ یہ ہیں:

وانا لما حملنا عليهم انكشفوا فاكببنا على الغنائم فاستقبلنا بالسهام. (بخاری غزوۂ حنین)

اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے، تو انہوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں، حضور انور ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ان طلقاء کو قتل کر دیجئے، ان ہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے، الفاظ یہ ہیں:

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا بك (غزوۃ النساء مع الرجال)

ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان ہی نے آپ کو شکست دلوائی۔

امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من في قلبه مرض من مسلمي اهل مكة المؤلفة و مشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجاءةً لا نصبابهم عليهم دفعة واحدة ورشقهم بالسهام ولا ختلاط اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان في قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة (غزوۂ حنین)

سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہوگئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انہوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۱ پر)

ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ پر سوار

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۰) مورخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہلِ مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص ۱۶۶۰ لائیڈن)

متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے ، ان الطلقاء انجفلوا یومئذ بالناس وجلوا عن النبی ﷺ (ابن جریر طبری ج ۱۰ ص ۶۲)

عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں :

یقال ان الطلقاء من اھل مکۃ فروا وقصدوا القاء الھزیمۃ فی المسلمین (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۴) کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے۔

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں :

وکان اول من انھزم الطلقاء مکرا منھم وکان ذلک سببا لوقوع الخلل وھزیمۃ غیرھم (ج ۱۰ ص ۶۶) سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے، اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی ۔

اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ ۔ (لوگ پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ تنہا رہ گئے) مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ تھے، وہاں کوئی نہ تھا، اسی لئے اسی روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیک یارسول اللہ ابشر نحن معک ! (ہم حاضر ہیں یارسول اللہ ﷺ آپ خوش رہیں کہ ہم آپؐ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں: لبیک یا رسول اللہ وسعدیک نحن بین یدیک (بخاری غزوۂ طائف) (ہم حاضر ہیں یارسول اللہ! ہم آپؐ کے سامنے ہیں)۔

حافظ ابن حجر نے حضور انور ﷺ کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے :

ویجمع بین قولہ حتی بقی وحدہ وبین الاخبار الدالۃ علی انہ بقی معہ جماعۃ بان المراد بقی وحدہ متقدما علی العدو والذین ثبتوا معہ کانوا ورائہ (ج ۸ ص ۲۴ مصر) اور اس قول میں کہ حضور ﷺ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ صحابہؓ کی ایک جماعت تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تھے اور جو آپؐ کے ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپؐ کے پیچھے تھے ۔

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابوسفیانؓ بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھے اور آپؐ کی سواری کی لگام (بقیہ حاشیہ ص ۳۸۲ پر)

ہے، میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی، اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثنا میں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے، بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی (۱)۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۱) تھامے تھے (غزوۂ حنین بخاری) مسلم میں حضرت عباسؓ کے پرزور الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیانؓ بن حارث نے حضور ﷺ سے علاحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا وابوسفيان بن الحارث بن عبدالمطلب رسول الله ﷺ فلم نفارقه (مسلم غزوۂ حنین) صحیحین کی ان روایات کے سوا روایاتِ ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

۱۔ ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)۔

۲۔ ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور انور ﷺ کے ہم راہ سو آدمی نہیں باقی رہ گئے تھے (ترمذی ابواب الجهاد باب ماجاء في الثبات عند القتال)۔

۳۔ مسند احمد (ج اول ص ۴۵۳) وحاکم میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے کہ اس دن حضورؐ کے ہم راہ ۸۰ آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

۴۔ بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۲) ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتلائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے، بقیہ انصار تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)۔

۵۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور انور ﷺ کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہلِ بیت میں سے حسب ذیل اصحاب موجود تھے:

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، حضرت ابوسفیانؓ بن حارث، حضرت جعفرؓ بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباسؓ، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت اسامہؓ بن زید، حضرت ایمن بن ام ایمن۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ "بقي وحده" اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے، حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے، لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔

دوسری روایات میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں، ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۲) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرورِ کونین ﷺ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچنے لگے، یہاں تک کہ خاصی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہو گئی، اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے)"س"

(۱) صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۲ ص ۶۱۸)"س"۔

شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا، زیادہ تر فتحِ مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے، وہ جوانی کے غرور میں اسلحۂ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے (۱)، فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے (۲) ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، میدان جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا (۳) کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور درّوں میں جا بجا جما دیئے تھے، فوجِ اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا، حملہ کیا، میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے، حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں، ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینھ برسا دیا، مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، صحیح بخاری میں ہے: فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ (۴) یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت ﷺ اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینھ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں، لیکن ایک پیکر مقدس پابرجا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعہ کائنات تھا ﷺ۔

آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی ''ہم حاضر ہیں'' پھر آپؐ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی، آپؐ سواری سے اتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجہ میں فرمایا ''میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں''۔(۵)

بخاری کی دوسری روایت میں ہے۔(۶)

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب — میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

---

(۱) بخاری باب الجہاد (باب من صف اصحابہ عند الھزیمۃ ونزل عن دابتہ) ''س'' (۲) مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے، جیسا کہ عمدۃ القاری جلد ہشتم ص ۳۵۹ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ النساء مع الرجال میں ہے، لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے، راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے، اس لئے مہاجرین وانصار جیسا استقلال وثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا''۔ ''س'' (۳) بخاری باب الجہاد (باب مذکور) ''س'' (۴) بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الطائف ج ۲ ص ۶۲۱، غزوۂ طائف۔ (۵) صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۲۱ غزوۂ طائف۔ (۶) ایضاً باب یوم حنین ج ۲ ص ۶۱۷۔

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے، آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انہوں نے نعرہ مارا: (۱)

یا معشر الانصار	او گروہِ انصار !
یا اصحاب الشجرۃ	او اصحاب الشجرۃ! (بیعتِ رضوان والے)

اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتاً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے، انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعتاً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے، لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر (کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ) طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی، جس کے ساتھ سپہ سالارِ لشکر (مالک بن عوف) بھی تھا۔ (۲)

اوطاس: درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا، آنحضرت ﷺ نے (حضرت ابو عامر اشعریؓ کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی، (حضرت ابو عامرؓ درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علمِ اسلام اس کے ہاتھ میں تھا، یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا (۳) درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہؓ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا، لیکن اچٹ کر رہ گئی، اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے" پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا" ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا "خدا کی قسم درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا" (۴)

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیماؓ بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا "میں تمہارے پیغمبر کی

---

(۱) ابن سعد جلد مغازی ص ۱۰۹ و ۱۱۲ "ض"۔ (۲) ایضاً "ض"۔ (۳) (مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۳۹۹) (۴) طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ۔

بہن ہوں"، لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے، انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا، یہ اس کا نشان ہے" فرطِ محبت سے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے"۔ انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں (۱)۔

محاصرۂ طائف: حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی، یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا، نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابوسفیان (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی، کفارِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا، یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے، طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمۃ نے جُرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ، ضَبّور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔ (۲)

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کی رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے۔ (۳)

آنحضرت ﷺ نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا، حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے، غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے، دبابہ پر اہلِ قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ

---

(۱) طبقات ابن سعد و اصابہ کتاب النساء ج ۸ ص ۱۲۳ و طبری (جلد ۳ ص ۱۶۶۸) (۲) طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ (و سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۲) "ض" (۳) تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۲۲ و ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۰) "ض"

ہو سکا، آنحضرت ﷺ نے نوفلؓ بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا، لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں۔

چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے (۱) صحابہؓ نے عرض کی آپ ان کو بد دعا دیں، آپؐ نے یہ دعا دی (۲)۔

اللّٰھم اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیمِ غنائم: محاصرہ چھوڑ کر آپؐ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی (۳)، اسیرانِ جنگ کے متعلق آپؐ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گذرنے پر کوئی نہ آیا، مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسبِ قاعدہ اہلِ فوج کو تقسیم کئے گئے خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر روساء جنہوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے، ان ہی کو قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیئے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان مع اولاد	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزیٰ	۱۰۰ اونٹ

(۱) ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۴۔۱۱۵) ''ض'' (۲) ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۵) ''س'' (۳) طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۰) ''س''۔

(ان کے علاوہ تین غیر ملکی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس تمیمی	۱۰۰ اونٹ
عیینہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے، عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں، لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا، اسلئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں (۱)۔

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی، عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں (۲)، بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے (۳)۔

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا، جس میں لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ کیا تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ "حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے" (۴) صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب الانصار (ج۱ ص۵۳۳) میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا "آپؐ نے جو سنا صحیح ہے"۔

آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فنِ بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے

---

(۱) (طبقات ابن سعد جزء مغازی ص۱۱۰ و زرقانی علی المواهب ج ۳ ص ۴۲) "س" (۲) صحیح بخاری (کتاب المغازی) "ض" غزوۂ طائف (ج ۲ ص ۶۲۱) "ض" (۳) صحیح بخاری کتاب المغازی مطبع نظامی ج ۲ ص ۶۲۱ و ۶۲۰۔
(۴) صحیح بخاری ج۲ ص۶۲۰ (باب غزوۃ الطائف) "س"۔

میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔"

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے"۔(۱)

آپؐ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد ﷺ تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا، تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا، ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ"۔

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہیں"۔ اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں، آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا، حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلب کے لئے دیا (۲)۔

حنین کے اسیرانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ کی تھیں، رئیسِ قبیلہ (زہیر بن صُرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، ان ہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، خدا کی قسم اگر سلاطینِ عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے، لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو"۔ نمازِ ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے، لیکن میں تمام مسلمانوں

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۰ و ۶۲۱ باب غزوۃ الطائف و فتح الباری ج ۸ ص ۴۱) "س"۔ (۲) صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں"۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے، ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعتاً آزاد تھے(۱)۔

واقعاتِ متفرقہ: (حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت ﷺ نے ابراہیم رکھا، آنحضرت ﷺ کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی، ڈیڑھ سال (سترہ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا، جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سورج گرہن ہوا، عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کے موت کی علامت ہے، لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا"۔ اس کے بعد آپؐ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔(۲)

آنحضرت ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا(۳)۔

(۱)(طبری ج ۳ ص ۱۶۷۶ "س" وطبقات ابن سعد جلد مغازی ص ۱۱۱)"ض"۔(۲) بخاری باب کسوف (باب الصلوۃ فی کسوف الشمس و باب الصدقۃ فی الکسوف ج ۱ ص ۱۴۱ و ۱۴۲)"ض"(۳) (طبقات ابن سعد ذکر نساء جلد ۸ ص ۲۲ و اصابہ ج ۸ ص ۹۲)"ض"۔

۹ ہجری

واقعۂ ایلا و تخییر و غزوۂ تبوک

ایلا اور تخییر ۹ ہجری (۱): رسول اللہ ﷺ زاہدانہ اور تمام زخارفِ دنیوی سے بے گانہ زندگی بسر کرتے تھے، دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدۃ العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔

ازواجِ مطہرات اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے اور گو شرفِ صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا، تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحاتِ اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواجِ مطہرات میں بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں، حضرت ام حبیبہؓ تھیں جو رئیسِ قریش کی صاحب زادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیسِ اعظم تھا، حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی تھیں، حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروقِ اعظمؓ تھے، بشریت کے اقتضا سے ان

(۱) (بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ ہجری کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے، لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو یہ سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی، غسان کا حملہ ۹ ہجری میں ہونے والا تھا، حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل ۹ ہجری کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۰)"س"۔

میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا، آنحضرت ﷺ سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ ع باسایہ ترانمی پسندم کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا، انہوں نے آپؐ کے سامنے پیش کیا، آپؐ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپؐ نے نوش فرمایا، اس میں وقتِ مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہئے کہ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے، (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت ﷺ نے قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری (۱):

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ (تحریم ۔ ۶۶ : ۱)	اے پیغمبر! اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو۔

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے۔

فان قلت كيف جاز لعائشة و حفصة الكذب والمواطأة التى فيها ايذاء رسول الله ﷺ قلت كانت عائشة صغيرة مع انها وقعت منها من غير قصد الايذاء بل على ماهو من جبلة النسأ فى الغيرة على الضرائر۔ (تفسیر سورۂ تحریم جلد ۹ ص ۲۲۶)	اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت ﷺ کے خلاف سازش کرنا کیوں کر جائز تھا، تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کم سن تھیں، اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت ﷺ کو ایذاء دینا نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں، اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔

لیکن علامۂ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلا کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ رہجری میں واقع ہوا تھا، اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہؓ کم سن تھیں، لیکن اور ازواجِ مطہراتؓ جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت ﷺ کی شادی کے وقت ۲۱ برس کی تھی۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ تحریم ج ۲ ص ۷۲۹ و ۷۳۰، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق (باب لم تحرم ما احل اللہ لک ج ۲ ص ۷۹۲ و ۷۹۳) ''ض'' میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواجِ مطہرات بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہؓ تھیں۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے (۱) مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں (۲) البتہ ازواجِ مطہراتؓ کا ایکا کرنا بہ ظاہر محلِ اعتراض ہوسکتا ہے، لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ معصوم تھیں، یا اپنے انجاحِ مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں، اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے فرمائی اور تاکید کردی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا، اس پر یہ آیت اتری:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۔

(تحریم ۔۶۶:۳)

اور جب کہ پیغمبر نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انہوں نے فاش کردی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کردی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا، پھر جب ان سے کہا تو انہوں نے کہا کہ آپؐ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی ۔

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نے باہم مظاہرہ کیا یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی شان میں یہ آیتیں اتریں:

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ ۔

(تحریم ۔۶۶:۴)

اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہؐ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہؐ کے مددگار ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے، لیکن توسیعِ نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواجِ مطہراتؓ شریک تھیں، آنحضرت ﷺ کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپؐ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہراتؓ سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا،

(۱) (مسند احمد جلد ۶ ص ۲۴۹) ''س''۔ (۲) عمدۃ القاری جلد ۹ ص ۲۲۶ ''س''۔

آپؐ نے بالاخانہ (۱) پر تنہا نشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دی، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے دلچسپ اور پراثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے، اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آ گئے ہیں، جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے (۲)۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہم سایہ تھے اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور ان پر غالب رہتے تھے، لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں، ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی، ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا، انہوں نے الٹ کر جواب دیا، میں نے کہا تم میری بات کا جواب دیتی ہو، بولیں تم کیا ہو، رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت ﷺ سے روٹھی رہتی ہیں، میں نے دل میں کہا، غضب ہو گیا اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت ﷺ سے رات بھر روٹھی رہتی ہے، حفصہؓ نے اقرار کیا، میں نے کہا تجھ کو یہ

(۱) بالاخانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے، اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا لیکن یہ قطعاً غلط ہے، مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا، حضرت عمرؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے، اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجد نبویؐ سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑ دوڑ کر جلدی جلدی کبھی ادھر کبھی اُدھر جاتے تھے، ابوداؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالاخانہ تھا، جو مسجد نبویؐ ہی سے متصل دیگر ازواجِ مطہرات کے حجروں کے برابر تھا (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الامام یصلی من قعود) ج ۱ ص ۸۹ ''س''۔ (۲) یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجھا ج ۲ ص ۷۸۰ تا ۷۸۲ وباب ھجرۃ النبی ؐ نساءہٗ الخ ج ۲ ص ۷۸۳ و ۷۸۴) ''ض''، طلاق (باب قولہ تعالی للذین یولون من نسائھم الخ ج ۲ ص ۷۹۷)، کتاب العلم (باب التناوب فی العلم ج ۱ ص ۱۹) ''ض'' میں باختلافِ عبارت منقول ہے، صحیح مسلم باب النکاح (کتاب الرضاع باب فی الایلاء و اعتزال النساء الخ جلد ۱ ص ۴۷۷ تا ۴۸۲) ''ض'' میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے، ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے، ہم نے تاامکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

خیال نہیں کہ رسول ﷺ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے، بخدا رسول اللہ ﷺ میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے، پھر حضرت ام سلمہؓ کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی، بولیں کہ عمرؓ! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے، یہاں تک کہ اب رسول اللہ ﷺ اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

''کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انہوں نے کہا غضب ہوگیا، میں نے کہا کیا غسانی(۱) مدینہ پر چڑھ آئے، بولے کہ نہیں، اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ آیا، آنحضرت ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر بالا خانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے، میں حفصہؓ کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے، میں نے کہا ''میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا''۔ حفصہؓ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبویؐ میں آیا، دیکھا تو صحابہؓ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا، لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا اٹھ کر بالا خانہ کے پاس آیا اور رباح (خادمِ خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا، میں اٹھ کر پھر مسجد میں چلا آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے تاب ہو کر بالا خانہ کے نیچے آیا اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا رباح! میرے لئے اذن مانگ، شاید رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے آیا ہوں خدا کی قسم رسول اللہؐ فرمائیں تو حفصہؓ کی گردن اڑا دوں، آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی (۲) پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے سبب پوچھا، میں نے عرض کی اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر و کسریٰ، باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور

(۱) غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا (۲) (بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی، لیکن چٹائی جس سے بنی جاتی ہے، اس سے بنی ہوئی تھی (فتح الباری ج ۹ ص ۲۵۱)۔

پیغمبر ہو کر آپ کی یہ حالت ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ’’کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت‘‘۔

میں نے عرض کی، کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپؐ نے فرمایا ’’نہیں‘‘ میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہؓ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا تھا، آپؐ بالا خانہ سے اتر آئے (۱) اور عام باریابی کی اجازت ہوگئی، اس کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔

(اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریق احسن رخصت کر دوں اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو خدا نے تم میں سے نیکو کاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے)۔

(الاحزاب۔ ۳۳ : ۲۸،۲۹)

اس آیت کی رو سے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہراتؓ کو مطلع فرمادیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں، دنیا اور آخرت، اگر تم دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلب گار ہو تو خدا نے نیکو کاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

---

(۱) (آنحضرت ﷺ بالاتفاق ۲۹ روز بالا خانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا، اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے، مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے، لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کو واقعۂ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا، اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے، لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے، راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا، بخاری کی اس روایت سے جو کتاب النکاح باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها (ج ۲ ص ۷۸۰ تا ۷۸۲) ’’ض‘‘ اور کتاب اللباس باب ما كان يتجوز رسول الله ﷺ من اللباس والبسط (ج ۲ ص ۶۶۸ و ۶۶۹) ’’ض‘‘ میں مذکور ہے، یہ صاف تصریح موجود ہے، اس بنا پر اس فقرہ کو یوں پڑھنا چاہئے کہ جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا) ’’س‘‘۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اترے اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہؓ پیش پیش تھیں، ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا، انہوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں، تمام اور ازواجِ مطہراتؓ نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلا، تخییر، مظاہرۂ حفصہؓ و عائشہؓ، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بیں یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری باب النکاح (باب موعظة الرجل ابنته ج ۲ ص ۷۸۰ تا ۷۸۲) میں حضرت ابن عباسؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے، اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواجِ مطہراتؓ سے انعزال، افشائے راز آیتِ تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:

وهذا هو اللائق بمكارم اخلاقه صلی اللہ علیہ وسلم وسعة صدره و كثرة صفحه وان ذلك لم يقع منه حتىٰ تكرر موجبه منهن. (فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۴)	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق، کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے، اور آپؐ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں)۔

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی، جس کا اثر بہت پر خطر تھا، آیتِ مذکور یہ ہے:

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ. (تحریم۔ ۶۶:۴)	اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ) رسولؐ کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا اور جبریلؑ اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں،

لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پر خطر ہو سکتی ہے، جس کی مدافعت کے لئے ملاءِ اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہِ کثیر موجود تھا، جن کی تعداد (۴۰۰) تک بیان کی گئی ہے، یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں، (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلندح کے حال میں لکھا ہے، وكانت تحرش بين ازواج النبى ﷺ (۱) (وہ ازواج مطہراتؓ کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آچکی تھی، رسول اللہ ﷺ پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسانؓ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت ﷺ کی سالی حمنہ جو حضرت زینبؓ کی بہن تھیں، سازش میں آگئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریکِ تہمت تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی برأت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہراتؓ کی کششِ خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ تھیں، ان کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو رسول کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہؓ کا سر لے کر آؤں۔

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے، یعنی اگر عائشہؓ و حفصہؓ سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور خدا کے ساتھ جبریلؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایات کاذبہ: ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خدا عیاں کی ہیں

---

(۱) (ج ۸ ص ۲۱۸) "ض"۔

کہ بڑے بڑے مورخین وارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کردیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواجِ مطہرات ؓ کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرلی تھی، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں، جن کو عزیز مصر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفتاً بھیجا تھا، ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا راز جو حضرت حفصہ ؓ نے فاش کردیا تھا، ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا۔

اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابلِ ذکر ہیں، لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیارِ اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں، ان کا گلِ سرسبد یہی ہیں، اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔

ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے، لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت ﷺ کی موطوءۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ ؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرحِ صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں:

ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول الله ﷺ لحفصة لا یقرب امته (ص ۵۰۳ ج ۸)

اور سعید بن منصور نے سندِ صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ ؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہیثم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

وللطبرانی من طریق الضحاک عن ابن عباس قال دخلت حفصة بیتھا فوجدته یطاء ماریة فعاتبته

(فتح الباری مطبوعۂ مصر ج ۸ ص ۵۰۳)

اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہ ؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت ﷺ کو حضرت ماریہ ؓ کے ساتھ ہم بستر دیکھا، اس پر انہوں نے آنحضرت ﷺ کو معاتب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے، ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ ص ۵۴۸ میں لکھتے ہیں :

والصحیح فی سبب نزول الآیة انه فی قصة العسل لا فی قصة مارية المروی فی غیر الصحیحة وقال النووی ولم تات قصة مارية من طریق صحیح ۔

اور آیت کی شانِ نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے، ماریہ کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحاح کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے، نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں، اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو، لائقِ التفات نہیں، حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے، یعنی وہ روایت جس کے راویِ اخیر مسروق ہیں (۱)

لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے، اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کو نہیں دیکھا تھا، اس لئے یہ روایت اصولِ حدیث کی رو سے منقطع ہے، یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔

اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے (۲) لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دار قطنی نے لکھا ہے:

کثیر الخطاء فی الا سانید و المتون کان یحدث من حفظه (۳)

سندوں میں اور اصل الفاظ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں اور اپنے حافظ کی بنیاد پر حدیث بیان کرتے ہیں ۔

یہ امر مسلم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور (۴) نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ)

(۱) فتح الباری تفسیر سورہ تحریم ج ۸ ص ۵۰۳ ۔ (۲) ج ۴ ص ۳۸۶ ۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۲۰

(۴) (یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں، ورنہ نسائی کتاب عشرۃ النساء باب الغیرۃ ج ۲ ص ۸۰ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اصرار سے آنحضرت ﷺ نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے)"س"۔

قطعی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں، صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطاء ہے، ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔

یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدو کاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جاسکتے، نہ کہ اس ذاتِ پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا ﷺ۔

غزوۂ تبوک

رجب* ۹ھ ہجری مطابق نومبر ۶۳۰ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے، جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔

جنگِ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس لئے قیصرِ روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا، مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں، آنحضرت ﷺ کے ایلا کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعتاً آ کر یہ کہا کہ ''غضب ہو گیا'' تو انہوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آ گئے (۱)

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغنِ زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی (۲) کہ رومیوں نے شام میں لشکرِ گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کر دی ہیں، اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آ گیا ہے (۳) مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ ''محمد ﷺ نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں''۔ اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، سوءِ اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا (۴) منافقین جو بظاہر

---

*ماہ رجب، ارباب سیر کا متفقہ قول ہے جو ۹ ہجری میں اکتوبر، نومبر میں پڑا تھا لیکن قرآن مجید میں غزوہ کا شدید گرمی میں ہونا مذکور ہے، عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ یہ غزوہ سفر طائف کے چھ ماہ بعد پیش آیا (زرقانی ج ۳ ص ۷۱ بحوالہ ابن حجر) اس لحاظ سے اس سفر کا گرمی کے موسم میں امکان ہے۔ ''ض'' (۱) بخاری ذکر واقعۂ ایلاء (کتاب التفسیر تفسیر سورۂ تحریم باب تبتغی مرضات ازواجک ج ۲ ص ۷۳۰ و کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا ج ۲ ص ۷۸۱) ''ض'' (۲) مواہب لدنیہ (مع زرقانی ج ۳ ص ۷۲۔ (۳) (طبقات ابن سعد غزوات ص ۱۱۹) ''ض'' (۴) مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ ''چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے، اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں، جب فوائدِ جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے''، لیکن یہ مارگولیتھ صاحب کا حسنِ ظن ہے، (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) ''س''

اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے (۱) اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ:

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ (توبہ۔ ۹ : ۸۱) گرمی میں نہ نکلو۔

سویلم ایک یہودی تھا اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے، چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے تمام قبائلِ عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی (۲) صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ نے دوسو اوقیہ چاندی اور دوسو اونٹ پیش کیے (۳) اکثر صحابہؓ نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں، تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت ﷺ کو ان پر رحم آیا، تاہم ان کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا، ان ہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اتری ہیں: (۴)

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (توبہ۔ ۹ : ۹۲)

اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کرسکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا جب آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے، چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواجِ مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں، اہلِ حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیز خاص کا رہنا ضرور تھا، اس لئے اب کی یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا، لیکن انہوں نے شکایت کی کہ ''آپؐ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں'' آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی'' (۵)

---

(۱) ابن ہشام (ج۲ص۳۳۲) ''ض'' (۲) (ابن سعد جزء المغازی ص ۱۱۹) ''س'' (وابن ہشام ج ۲ص۳۳۲و ۳۳۳) ۔(۳) (زرقانی ج ۳ ص ۷۲) ''س'' (۴) (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۳) ''ض'' (۵) صحیح بخاری کتاب المغازی غزوۂ تبوک ج ۲ص ۶۳۳ (وسیرت ابن ہشام ج ۲ص ۳۳۴) ''ض'' ۔

غرض آپؐ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے، جس میں دس ہزار گھوڑے تھے(۱) راہ میں وہ عبرت ناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے اور نہ کسی کام میں لائے۔(۲)

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی، لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا، صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے، لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیسِ غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ ''میں نے سنا ہے کہ محمدؐ نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا''۔ حضرت کعبؓ گو معتوبِ نبویؐ تھے، لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا(۳)۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے بیس دن تک قیام کیا(۴) ایلہ(۵) کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضرِ خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا(۶)، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا جس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی(۷) جربا اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی،(۸) دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے، وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیرِ اثر تھا، آنحضرت ﷺ نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربار رسالت میں حاضر ہو کر شرائطِ صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا، آپؐ نے اس کو امان دی۔(۹)

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ

---

(۱) طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۹) ''س'' (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی ذکر غزوہ تبوک باب نزول النبیؐ الحجر ج ۲ ص ۶۳۷ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۵) (۳) (ج ۲ ص ۶۳۵) ''ض'' (۴) طبقات ابن سعد (جزء مغازی غزوات ۱۱۹) ''ض'' (۵) (یہ مقامِ خلیج عقبہ کے پاس ہے، (مارگولیتھ) (۶) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۸) ''ض'' (۷) زرقانی، بحوالہ ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۸۶) ''س'' (۸) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۸) ''ض'' (۹) طبقات ابن سعد ج مغازی ص ۱۲۰ ''ض''

اشعار گاتی نکلیں (۱)

طلع البدر علینا　　من ثنیات الوداع

وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔

وجب الشکر علینا　　ما دعا للہ داع

جب تک خدا کا پکارنے والا دنیا میں کوئی باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔

مسجد ضرار: منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دیں، ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبویؐ میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آ کر نماز ادا کر لیا کریں، ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دوں (۲)

آنحضرت ﷺ جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے، آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تو مقبول ہو جائے، آپؐ نے فرمایا، اس وقت میں مہم پر جا رہا ہوں، جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معنؓ بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں (۳)

اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں :

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ . لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ .

(توبہ۔ ۹ : ۱۰۷ تا ۱۰۸)

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسول سے لڑتے ہیں، ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں، محمد! تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو، وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

---

(۱) (زرقانی ج ۳ ص ۹۲) ''س''۔ (۲) زرقانی بحوالہ ابن جریر (ج ۳ ص ۹۱) ''س''۔ (۳) (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۴۱) زیادہ تفصیل زرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۹۰ و ۹۱ پر ہے ''ض''۔

حجِ اسلام اور اعلانِ برأت: مکہ ۸ھ ہجری میں فتح ہوا، (لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان نہیں قائم ہوا تھا، اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکانِ حج انجام پائے۔ مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے، فریضۂ حج ادا کیا، اب) ۹ھ ہجری پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادتِ ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے، غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ھ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیبِ اسلام اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ (۱) وغیرہ معلم تھے، قربانی کے لئے (آنحضرت ﷺ کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حج اکبر (۲) کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسمِ حج اصل ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی، اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتداء کا اعلان کیا جائے، مناسک و رسومِ حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے، زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے، سورۂ برأت کی چالیس آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہ داخل ہو سکے گا، نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقضِ عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ پڑ گیا۔ (۳)

---

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لا یطوف با لبیت عریان ج ۱ ص ۲۲۰ وباب حج ابی بکرؓ بالناس وتفسیر سورہ برأت باب قولہ فسیحوا فی الارض الخ وباب قولہ واذان من اللہ الخ و باب قولہ الاالذین عاھدتم الخ ج ۲ ص ۶۷۱ وصحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک الخ ج ۱ ص ۵۱۷۔ (۲) سورۂ توبہ میں ہے، یوم الحج الاکبر، مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے، اس کو بھی گو بعض علماء نے اختیار کیا ہے، لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے، بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حج اکبر ہے، اور عمرہ حج اصغر ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۰ ص ۴۲) ”س“۔ (۳) مسند ابن حنبل ص ۲۹۹ جلد ۲ عام تفصیل زرقانی ج ۳ ص ۱۰۲ وغیرہ میں موجود ہے) ”س“

سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں جس میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا یہ ہیں: (۱)

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ. فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ. وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ.

(توبہ۔ ۹: ۱ تا ۴)

اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اور انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا) ان کی خدا اور خدا کے رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے، اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے، حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلانِ عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں، اگر (تم نے اے مشرکین) توبہ کر لی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے، اے پیغمبر تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے، لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کے ایفا میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو زمانہ معاہدہ کو تم پورا کرو، خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

(توبہ۔ ۹: ۲۸)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں، اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔

(طبری نے بواسطۂ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان (۲) ہو گئے)

واقعات متفرقہ: (نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا، اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے، اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیل زکوٰۃ کے لئے عمال

---

(۱) (ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلحِ حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے، لیکن وہ معاہدے تو فتحِ مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب (مکاتیب شبلی حصہ دوم مکتوب نمبر ۷۳، ص ۵۱۔۵۲) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ ہجری میں فتحِ مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیئے ہیں، لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ ہجری میں نازل ہوئی ہوں، لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاحِ ستہ کے مستند روایات میں مذکور ہے، ۹ ہجری کے موسم حج میں ہوا ہو) ''س''۔ (۲) ج ۴ ص ۱۷۲۱ ''س''۔

قبائل میں مقرر ہوئے۔(۱)

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں، ان کے لئے جزیہ کی یہ آیت اتری:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ . تا آنکہ چھوٹے بن کرو جزیہ ادا کریں۔

(توبہ۔۹ : ۲۹)

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے اس کا اعلانِ عام فرمایا۔

نجاشی (۲) جس کے ظلِ حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے امسال انتقال کیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ ''مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو''۔اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی)۔

☆

(۱)(طبری جلد ۴ص ۱۷۲۲)''س'' ۔(۲) (تاریخ طبری ج ۴ص ۱۷۲۰۔غائبانہ نماز جنازہ کا ذکر صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں ہے)''ض''۔

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانحِ زندگی پر محدود ہے، بحث وتدقیقات اور رفعِ شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں، اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں، ان ہی حصوں میں لکھے جاتے، لیکن کتبِ سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ ترنمایاں ہیں صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیفِ سیرت کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے، چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق، مغازی واقدی، یہ اندازِ تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دیا جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔

ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں نہ صرف بدنیتوں نے، بلکہ نیک دلوں نے بھی، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ وغارت گری: اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو جنگ وغارت گری سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق

وعادات، رسوم و معاملات، محاسن واوصاف، معائب ومثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اسی سے بنتی اور اسی سے نشو ونما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا، کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی، لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے، خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ، بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بن کر کمل بناتے تھے، لیکن یہ جائداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی، اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابوعلی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے (۱):

(وذلک انهم کانوا یکرهون ان تتوالی علیهم	(یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین ماہ متواتر اس
ثلثة اشهر لا تمکنهم الاغارة فیها لان معاشهم	طرح گذر جائیں کہ ان میں وہ غارت گری نہ کر سکیں کیوں
کان من الاغارة)	کہ ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا)

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں ''غنم'' کہتے ہیں اس لئے لوٹ کے مال کو عربی میں ''غنیمت'' کہنے لگے (۲) اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج وتخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا، آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز واقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے سالماً غانماً یعنی ''سلامت آنا اور لوٹ کر لانا'' ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو غنیمت کہتے ہیں، (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورتِ معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہوگئی تھی، تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے، جن کو ''اشہرِ حرم'' کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، لیکن متصل تین تین مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا، اس لئے نسئی ایک رسم ایجاد

(۱) جلد اول ص ۴ مطبوعہ مصر۔ (۲) (یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی) ''س''

کرلی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسبِ ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:

کانوا یجعلون المحرم صفرا و یجعلون صفرا المحرم لئلا یتوالی علیھم ثلثۃ اشھر لا یتعاطون فیھا القتال الخ (ج ۸ص ۲۴۴)

وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کردیا کرتے تھے تاکہ پے در پے تین مہینے لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں۔

ثار کا عقیدہ: لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا، لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے، ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سیکڑوں برس گذر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام ونشان مٹ جاتا تھا، تاہم جب تک قاتل کے قبیلہ کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا، قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں، اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کردیا تھا، لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزءِ اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ مقتول جب مرجاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقامِ قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ ''مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں'' اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے تھے۔

ابودواد ایادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیھم ۔۔۔ فلھم فی صدی المقابر ھام (۱)

ان پر موت مسلط ہوگئی اور مقبروں کے ''صدی'' میں ان کے لئے ''ہام'' ہے۔

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یاعمرو ان لا تدع شتمی و منقصتی ۔۔۔ اضربک حیث تقول الھامۃ اسقونی (۲)

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو۔

---

(۱) لسان العرب ج ۳ ص ۸۴۶ لفظ ہام دار لسان العرب، بیروت (۲) کتاب الاغانی ذکر ذی الاصبع العدوانی الخ ج ۳ ص ۹

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے:

واترک فی قبر بصعدۃ مظلم (۱)

خوں بہا لوگے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا۔

اسی بنا پر خوں بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے:

ومشوا بآذان النعام المثلم (۲)

اور خوں بہا لینا ہے تو بوچے شتر مرغ کا کان پکڑ کرلے جاؤ،

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔

ولا تراھم وان جلّت مصیبتھم

مع البکاۃ علی من مات یبکونا (۳)

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو، لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم:

معاذ الا لہ أن ینوح نساء نا

علی ھالک او ان نضجّ من القتل (۴)

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے۔

من کان مسرورا بمقتل مالک

فلیات نسو تنابوجہ نھار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا

وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے،

یجد النساء حوا سراً یندبنہ

یلطمن اوجھھن بالاسحار (۵)

وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں

اور صبح کو اپنے چہروں پر دو ہتھڑ مار رہی ہیں،

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو ''حتفِ انف'' کہتے ہیں، یعنی ''ناک کی موت'' اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے۔

وما مات منا سیّد حتف انفہ

ولا طلّ منا حیث کان قتیل (۶)

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا

اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ہدر ہوا۔

---

(۱) دیوان الحماسہ باب الحماسہ جزء اول ص ۷۱، شاعرہ کا نام کبشہ ہے۔ (۲) ایضاً ص ۷۲۔ (۳) دیوان الحماسہ باب الحماسہ جزء اول ص ۲۷ مطبع سعادۃ مصر ۱۳۳۱ ہجری/۱۹۱۳ء یہ شعر بنی قیس بن ثعلبہ کے کسی شخص کا ہے۔ (۴) شعراء النصرانیہ القسم الثانی فی شعراء نجد والحجاز ص ۲۰۴ بیروت ۱۸۹۰ء۔ (۵) دیوان الحماسہ جزء اول باب المراثی ص ۴۱۳ یہ دونوں شعر ربیع بن زیاد کے ہیں۔ (۶) دیوان الحماسہ جزء اول باب الحماسہ ص ۲۹، یہ شعر سموأل بن عادیا کا ہے۔

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا تھا، یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے، یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائلِ عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا، حضرت عمروؓ بن مالک جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا ''بنو عقیل پر ہمارا ثار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں'' چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لا چکے تھے، حملہ آور ہوئے اور خود حضرت عمروؓ بن مالک نے اس میں شرکت کی، گو پھر ان کو بہت ندامت ہوئی کہ ان کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا۔ (۱)

لوٹ کا مال: چونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورتِ معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لئے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائعِ معاش میں سب سے زیادہ حلال وطیب اسی کو سمجھتے تھے، یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بہ تدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ. (بقرہ۔۲ : ۲۱۹)

لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا:

اللهم بين لنا فى الخمر بيانا شافيا (۲)

اے خدا! شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔

پھر یہ آیت اتری:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (نساء۔۴ : ۴۳)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

چنانچہ نماز کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک شخص منادی (۳) پکارتا کہ کوئی

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمروؓ بن مالک (ج ۳ ص ۱۳) ''س'' (۲) (ابوداؤد کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر ج ۲ ص ۵۱۷) ''ض'' (۳) مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۵۳ و ابوداؤد کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر ج ۲ ص ۱۵۷ ''س''

شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے ، پھر یہ آیت اتری:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ . إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ . (مائدہ۔۵ :۹۰ و ۹۱)

مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر، یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے، تو تم باز آؤ گے۔

باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید وتصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے، تڑوا دیئے ، لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں، اس سے بھی منع فرمایا (۱) ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے :

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا (مائدہ ۔ ۵ : ۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، انہوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں۔

اس موقع پر بہت سے صحابہؓ موجود تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے، انہوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے، حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی، چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔ (۲)

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم وعادت میں داخل ہو جاتی

(۱) برتنوں کے استعمال کی ممانعت آپؐ نے قبیلۂ عبدالقیس کے وفد کو کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری ومسلم کے مختلف ابواب میں ہے، دیکھو بخاری کتاب الایمان باب اداء الخمس من الایمان ج ۱ص ۱۳ ومسلم کتاب الایمان باب الامر بالایمان باللہ ورسولہ الخ ج ۱ص ۲۷ و ۲۸، برتنوں کے توڑنے کا ذکر صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر ج ۲ص ۱۶۹ پر اور شراب کے سرکہ بنانے کی حرمت بھی مسلم کی اسی کتاب کے باب تحریم تخلیل الخمر (ص ۱۷۰) میں وارد ہے (۲) (ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۲۱۳ پر بھی بہ روایت حاکم مذکور ہے۔)

ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگِ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا، لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے، اس پر یہ آیت اتری:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ . (انفال۔ ۸ : ۶۸) اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔

چنانچہ صحیح ترمذی ابواب التفسیر تفسیر (۱) انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے، آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ "جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا، اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا"، اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہؓ خود لڑے نہ تھے بلکہ علم اور رایت کے محافظ تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے (۲)، اس پر یہ آیت اتری:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال۔۸ : ۱) لوگ تجھ سے مال غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمت خدا اور رسول کی ہے۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے، اس کی تقسیم آنحضرت ﷺ کے اختیار میں ہے، جس طرح آپؐ چاہیں تقسیم فرمائیں، اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا، لیتا تھا، بند ہو گیا، لیکن میدانِ جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا، سنن ابی داؤد (۳) میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں"۔

خیبر کی لڑائی ۷ ہجری میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے، اس پر آنحضرت ﷺ کو نہایت غصہ آیا، آپؐ نے تمام صحابہؓ

(۱) ج ۲ ص ۱۳۹) "ض"۔ (۲) سنن ابی داؤد کتاب الجهاد باب فی النفل ج ۲ ص ۳۷۵ و ۳۷۶ کلکتہ ایڈیشن۔
(۳) کتاب الجهاد باب فی النهی عن النهبی ج ۲ ص ۳۶۹۔

کو جمع کیا اور فرمایا :

ان اللہ تعالی لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم (سنن ابی داؤد کتاب الخراج والفئی والامارۃ باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذا اختلفوا بالتجارۃ (ج ۲ ص ۴۳۲ کلکتہ ایڈیشن)

خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ نہیں جائز کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ (مگر با اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو، نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے، لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی، غزوۂ احد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ تیر اندازوں کو سخت تاکید فرمادی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے، ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا، حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

''غنیمت'' اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا، سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا لاالہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا، انہوں نے لاالہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا، جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ:

احرمتنا الغنیمۃ (۱) — تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپؐ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا کہ ''تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس اس قدر ثواب ملے گا''۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کئے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے، سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے''۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''اس

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقول اذا اصبح ج ۲ ص ۶۹۳ ۔

کو کچھ ثواب نہیں ملے گا'' یہ جواب انہوں نے آ کر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا، پھر جا کر پوچھو، انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا، لوگوں نے پھر ان کو بھیجا اور پھر آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا (۱)۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

جنگ میں وحشیانہ افعال: عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں، جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ اسیرانِ جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے، بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔

۲۔ غفلت یا نیند کی حالت میں دفعتاً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا، بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک بن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

۳۔ زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے، عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا، چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے، صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی، جس کا نام حمرا تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا، آ نکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا، اس نے کہا، میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی، جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے (۲)۔

واخزا کم عمرو کما قد خزیتهم
وادرک عمار اشقی البراجم

۴۔ بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا ج ۱ ص ۳۴۱۔ (۲) مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ آقائے میر محمد باقر طہرانی، ایران ۱۲۹۰ھ ص ۳۴۲۔

بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا، ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا، چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی (۱) اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔

۵۔ قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا، جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے (۲)۔

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ ظاہر اسلام لا کر آنحضرت ﷺ کے غلام کو پکڑ لے گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھیں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ (۳)

۶۔ مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے اعضاء کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا (۴)۔

۷۔ منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے، سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پئے گی (۵) یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ جو نکال کر چبا لیا تھا اس کا حال اوپر گذر چکا ہے۔

۸۔ حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے، عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیسِ ہوازن کہتا ہے:

بقرنا الحبالی من شنؤة بعد ما   خبطن بفیف الریح نہدا و خثعما (۶)

---

(۱) مجمع الامثال ص ۷۷۴۔ (۲) جلد ۳ ص ۵۲ و ۵۳۔ (۳) یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد (ج ۲ قسم اول) ص ۶۷ سے ماخوذ ہے، مسلم میں صرف آنکھوں کا اندھا کرنا مذکور ہے، کتاب القسامہ والمحاربین باب حکم المحاربین والمرتدین ج ۲ ص ۳۳ و ۳۴ ''ض'' صحیح بخاری کتاب المغازی باب قصة عكل وعرينه ج ۲ ص ۶۰۲۔ (۴) زرقانی ج ۲ ص ۵۴۔ (۵) طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول ص ۳۹ (سریہ مرثد بن ابی مرثد) ''س'' (۶) کتاب دیوان عبید و عامر ذکر عامر بن طفیل ص ۱۲۱ مطبع بریل لیڈن ۱۳۱۹ء۔

غزوات نبویؐ کے اسباب اور انواع (۱): تفصیلِ مذکورۂ بالا کے بعد ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزواتِ نبویؐ کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع علیہ السلام نے طریقۂ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔

مورخین نے "غزوہ" کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیئے گئے تو اس کو بھی انہوں نے غزوہ میں شمار کرلیا، غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی "سریہ" غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں، ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بہ نفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہیں، وہ چند قسموں پر منقسم ہے۔

۱۔ محکمہ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل وحرکت کی خبر رسانی۔

۲۔ دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

۳۔ قریش کی تجارت کی روک ٹوک تاکہ وہ مجبور ہوکر مسلمانوں کو حج وعمرہ کی اجازت دیں۔

۴۔ امن وامان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

۵۔ اشاعتِ اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت میں تاکید کردی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں۔

۱۔ دشمنوں نے دار الاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

۲۔ یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کررہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے، ان ہی مختلف اغراض سے تھے۔

---

(۱) یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے، جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کرلیا کہ اسلام کو مٹادیا جائے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیتِ عام ہے سب جاتا رہے گا، اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائلِ عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہوگیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہوجائے گی۔

بیعت عقبہ میں جب انصار آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے تو ایک انصاری نے کہا "برادرانِ من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کررہے ہو؟ یہ عرب وعجم سے اعلان جنگ ہے"۔

اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کرآئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہوگیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے، اوپر گذر چکا ہے (بحوالہ (۱) ابوداؤد) کہ قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ "محمدؐ کو وہاں سے نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کردیں گے"۔

محکمہ تفتیش: ان واقعات کی بنا پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جائے، چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت ﷺ نے اس انتظام پر توجہ کی، وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے، یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلّح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جاپڑنا ہوتا تھا۔

ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا، یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جاسکتے تھے، مثلاً:

---

(۱) کتاب الجہاد باب فی خبر النضیر ج ۲ ص ۴۲۳۔

سریۂ ابن جحش: ۲ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سر بہ مہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا، دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے:

فسر حتی تنزل نخلة بین مکة و الطائف فترصد بها قریشا و تعلم لنا من اخبارهم (طبری جلد ۳ ص ۱۲۷۴)	برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور ان کی خبریں دریافت کرو۔

مدافعت: اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں، اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں۔

سریۂ غطفان ۲ ہجری:

وذلک انه بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من بنی ثعلبة ومحارب بذی امرّ قد تجمعوا یریدون ان یصیبوا من اطراف رسول الله ﷺ جمعهم رجل منهم یقال له دعثور بن الحارث الخ. (طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم اول جلد مغازی ص ۲۳)	اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا، جس کا نام دُعثور ہے۔

سریۂ ابوسلمہ ۳ ہجری:

وذلک انه بلغ رسول الله ﷺ ان طلیحة وسلمة ابنی خویلد قد سارا فی قومهما ومن اطاعهما یدعونهم الی حرب رسول الله ﷺ الخ (ابن سعد جز ثانی قسم اول ص ۳۵)	اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ طلیحہ اور سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیرووں کو لے کر آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔

سریۂ عبداللہ بن انیس بہ غرض قتل سفیان بن خالد ۳ ہجری:

وذلک انه بلغ رسول الله ﷺ ان سفیان بن خالد الهذلی ثم اللحیانی وکان ینزل عرنة وما والاها فی ناس من قومه وغیرهم قد جمع الجموع لرسول الله ﷺ (ایضاً ص ۳۶)	ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع ۵ ہجری:

فاخبر اصحاب رسول الله ﷺ انّ انمارا وثعلبة قد جمعوا لهم الجموع فمضى(۱)

ایک جاسوس نے آ کر صحابہؓ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے فوجیں جمع کر رہے ہیں، آپ چل کھڑے ہوئے۔

غزوۂ دومة الجندل ۵ ہجری:

قالوا بلغ رسول الله ﷺ ان بدومة الجندل جمعا كثيرا.......... وانهم يريدون ان يدنوا من المدينة (ابن سعد جلد مغازی ص۴۴)

روات بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔

غزوۂ مریسیع ۵ ہجری:

ان بنى المصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بنى مدلج.......... وكان راسهم وسيدهم الحارث بن ابى ضرار فسار فى قومه ومن قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله ﷺ فاجابوه

(ابن سعد جزء ثانی قسم اول ذکر مغازی ص۴۵)

قبیلۂ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لے کر چلا اور لوگوں کو رسول اللہ ﷺ سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔

سریۂ علی بن ابی طالب بہ طرفِ فدک ۶ ہجری:

بلغ رسول الله ﷺ ان لهم جمعا يريدون ان يمدوا يهود خيبر۔

(ابن سعد جزء ثانی قسم اول ذکر مغازی ص۶۵)

آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریۂ بشیر بن سعد شوال ۷ ہجری:

بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعدهم عيينة بن حصن ليكون معهم ليزحفوا الى رسول الله ﷺ(۲)

آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے، اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ پر حملہ آور ہوگا۔

سریۂ عمرو بن العاصؓ، ذاتِ سلاسل ۸ ہجری: یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

(۱) (ابن سعد جلد مغازی ص۴۳۔) ''ض'' (۲) (ایضاً ص ۸۷) ''ض''۔

بلغ رسول اللہ ﷺ ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان یدنوا الی اطراف رسول اللہ ﷺ (۱)	آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک: بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابوجہل نے حضرت معاذ انصاریؓ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ ''اگر تم لوگ محمدؐ کو نکال نہ دو گے، تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے'' انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے'' (۲) (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا، مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی، کیوں کہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبلِ حدیبیہ: سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ یتعرض لعیر قریش یعنی اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے کہ ''کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے''۔ یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں، لیکن چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آ جاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مالِ تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا، اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک تھی جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی، جس کے رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی، قریش پر کاروانِ تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابوذر غفاریؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سر راہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، تو یہ تدبیر پوری کارگر

(۱) طبقات ابن سعد جلد مغازی ص ۹۵ ''ض'' (۲) بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ العشیرہ ج ۲ ص ۵۶۳۔

ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت ﷺ مکہ کے نومسلموں کو واپس دے دیں گے اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کرلیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کردیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ (پھر آئندہ سال انہوں نے مسلمانوں کو حج وعمرہ کی بھی اجازت دے دی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے)۔(۱)

امن وامان قائم کرنا: اوپر گذر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اس سرے تک مطلق امن وامان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے، تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی، جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ وپند بلکہ دست وبازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن وامان قائم کریں، کیوں کہ خوں ریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔ (مائدہ۔ ۵ : ۳۲)

اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کردیا، اس نے تمام عالم کو قتل کردیا۔

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَیُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ۔

(بقرہ۔۲ : ۲۰۵)

اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ۔ ۵:۳۳)

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کردیئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسرے طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کردیئے جائیں۔

---

(۱) فتح الباری جلد ۸ ص ۶۱۔

احادیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ”خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعا سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا یا بھیڑئے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھالے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا“ (۱) یہ ابوداؤد (۲) کے الفاظ ہیں، صحیح بخاری میں ہے (۳) کہ ”خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا“۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہلِ سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن وامان قائم کرنے کی غرض سے تھے، دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں:

سریۂ زید بن حارثہ: ۶ ھجری میں حضرت زیدؓ مالِ تجارت لے کر شام گئے، واپس آتے ہوئے جب وادیِ قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے، آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی (۴)۔

اسی سنہ میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت ﷺ نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آ رہے تھے، جب حِسمیٰ پہنچے تو ہُنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا، صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیئے، آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا (۵)۔

سریۂ دومۃ الجندل: ۴ ھجری میں آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو

---

(۱) (صحیح بخاری باب مالقی النبی ﷺ واصحابہ من المشرکین بمکۃ ج ۱ ص ۵۴۳)”س“ (۲) (کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الکفر ج ۲ ص ۳۵۸)”ض“ (۳) باب علامات النبوۃ (صحیح بخاری میں یہ حدیث کئی طرح سے آئی ہے حضرت خبّاب بن ارت سے جو روایت ہے اس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو ابوداؤد کے ہیں (ج ۱ ص ۵۱۰) اور عدی بن حاتم کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو آگے مصنف نے نقل کئے ہیں لیکن اس میں مزید تفصیل بھی ہے یعنی خزائنِ کسریٰ کی فتح وغیرہ کا ذکر ہے (ج ۱ ص ۵۰۷ و ۵۰۸)”ض“۔ (۴) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۶۵ جلد غزوات۔ (۵) ابن سعد (جلد غزوات)”ض“ ص ۶۳۔

مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے، ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے، جو تاجروں کو ستاتا ہے، اس کے تدارک کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے، مجمع منتشر ہو چکا تھا، لیکن آپ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں (۱)۔

سریۂ خبط یا سیف البحر: (یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کفارِ قریش کے کاروانِ تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی، ۸ ہجری میں قریش کا کاروانِ تجارت شام سے واپس آ رہا تھا، قبیلۂ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمرؓ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا، مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر دن دن بھر گذار دیا (۲)۔

صحیح مسلم (۳) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے، لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے، اصل راوی حضرت جابرؓ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے، ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی، کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے، دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں:

۱۔ نتلقیٰ عیر قریش، قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے۔

۲۔ نرصد عیر قریش، قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی ہے، کیوں کہ یہ زمانہ تو صلحِ حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی، حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق ہے) (۴)۔

غزوۂ غابہ: عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگر چہ ہر دفعہ ان کو

---

(۱) ابن سعد ص ۴۴ جلد غزوات۔ (۲) (ابن سعد جزء مغازی سریۂ خبط (ص ۹۵) "ض"۔ (۳) صحیح مسلم (کتاب الصید و الذبائح ومایوکل من الحیوان) "ض" باب اباحۃ میتۃ البحر (ج ۲ ص ۱۴۹ و ۱۵۰) "ض" صحیح بخاری (کتاب المغازی) "ض" باب غزوۃ سیف البحر (ج ۲ ص ۶۲۵ و ۶۲۶) "ض" میں بھی یہ روایتیں ہیں)۔

(۴) فتح الباری ج ۸ ص ۶۱ و ۶۲۔

سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں، تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، ڈاکے ڈالتے تھے، ۴ ہجری میں قبیلۂ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ نے فرطِ کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے، مویشی چرائے، لیکن ۶ ہجری میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، حملہ کیا، اور آنحضرت ﷺ کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے، ان کو قتل کر دیا (۱) چنانچہ اربابِ سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتحِ مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہ زنی، قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا، اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا، اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب: عرب کے قبائل دو قسم کے تھے، ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا، خیمے ڈال دیئے، جب وہاں بھی پانی نہ رہا، تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لائے اور وہاں چلے گئے، ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں، زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی، ان کی تعزیر کے لئے فوجیں جاتی تھیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے، اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں، اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں اور ان ہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر

[(۱) طبقات ابن سعد ذکر مغازی ص ۵۸] ’’ض‘‘۔

مارگولیتھ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ''چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے''۔

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقراء اور کدو کاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ ان ہی قوموں پر کیا جاتا تھا، جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیئے، اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیئے۔

غزوۂ بنو سلیم ۳ ہجری:

واغذ السیر .... فوجدھم قد تفرقوا فی میاھھم فرجع (ابن سعد مغازی صفحہ ۲۴)

اور بہت تیزی سے بگ ٹٹ گئے، لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیئے تھے (اس لئے لوٹ آئے)

غزوۂ ذات الرقاع ۴ ہجری:

وھربت الاعراب الی رؤس الجبال (ایضاً ص ۴۳)

اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریۂ عکاشہ ۶ ہجری:

وجہ رسول اللہ ﷺ عکاشۃ بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یغذ السیر ....فھربوا (ایضاً ص ۶۱)

آنحضرت ﷺ نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ غمر بھیجا، وہ بگ ٹٹ گئے .... لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔

سریۂ علیؓ بن ابی طالب الی بنی سعد ۶ ہجری:

فبعث الیھم علی بن ابی طالب فی مائۃ رجل فسار اللیل وکمن النھار حتی انتھی الی الھمج .... فاغاروا علیھم فاخذوا خمس مائۃ بعیروا لفی شاۃ وھربت بنو سعد بالظعن (ایضاً ص ۶۵)

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے، یہاں تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنو سعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔

غزوۂ بنولحیان ۶ ہجری :

(فسمعت بهم بنو لحيان فهربوا في رؤس الجبال) (ایضاً ص ۵۷)

بنولحیان نے ان کی آمد سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے ۔

سریۂ عمرؓ بن خطاب بہ طرف تربہ ۷ ہجری :

فكان يسير الليل ويكمن النهار فاتى الخبر هوازن فهربوا وجاء عمر بن الخطاب محالهم فلم يلق منهم احدا (ایضاً ص ۸۵)

راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہو گئے، حضرت عمرؓ ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا ۔

سریۂ کعب بن عمیر، ربیع الاول ۸ ہجری:

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پندرہ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کیا اور ان پر تیر اندازی شروع کی، مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے، اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے، انہوں نے آکر خبر کی، آنحضرت ﷺ نے ان سے انتقام لینا چاہا، لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے، ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں :

وهم بالبعث اليهم فبلغه انهم قد ساروا الى موضع آخر (ایضاً ص ۹۲)

ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ اور کہیں چلے گئے۔

اشاعتِ اسلام: (ان اغراض کے علاوہ اور جو سرایا بھیجے گئے، ان کی غرض اشاعتِ اسلام ہوتی تھی، لیکن چونکہ ملک میں امن وامان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اس سرے تک آگ لگا رکھی تھی، لیکن دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے، ان کی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر میں رہتی تھی۔

سریۂ بیر معونہ: صفر ۳ ہجری میں ستر داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیسِ قبیلہ کی دعوت پر اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجی گئی لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل وذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے تھے، جنہوں نے مدینہ آکر خبر کی (۱)۔

سریۂ مرثد: اسی زمانہ میں یعنی صفر ۳ ہجری میں قبیلۂ عضل وقارہ نے تعلیم وارشاد کے

---

(۱) (طبقات ابن سعد ذکر مغازی (ص ۳۷) "ض"

لئے دعاتِ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے حضرت عاصمؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنولحیان نے ان پر حملہ کیا اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیئے گئے۔(۱)

غزوۂ بنی لحیان: ۶ / ہجری میں بنولحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سن گن پا کر بھاگ (۲) گئے تھے)۔

سریۂ ابن ابی العوجاء: ۷ / ہجری میں آنحضرت ﷺ نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے، قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی، اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاء تھے، انہوں نے بنوسلیم کو دعوت دی، لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیر اندازی شروع کی، یہ لوگ بھی لڑے، لیکن پچاس آدمی قبیلہ کے قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رئیسِ فوج یعنی ابن ابی العوجاء کے سوا سب شہید ہوئے۔(۳)

سریۂ کعبؓ بن عمیر: ربیع الاول ۸ / ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوتِ اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے، ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی، لیکن جواب وہی تیغ وسنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے، جنہوں نے آکر مدینہ میں خبر کی (۴)۔

(اس بنا پر اکثر دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے، ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی، لیکن اس صورت میں یہ تصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۰ آدمیوں کی جمعیت) ساتھ کر دی، تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں، چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

---

(۱) (طبقات ابن سعد ذکر مغازی ص ۳۹ و ۴۰) "ض"۔(۲) (ایضاً ص ۵۷) "ض" (۳) (ایضاً ص ۸۹) "ض"
(۴) (طبقات ابن سعد جلد مغازی ص ۹۲) "ض"۔

بعثه الی بنی جذیمة داعیا الی الاسلام ولم یبعثه مقاتلا (۱)

آنحضرت ﷺ نے خالدؓ کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، دعوتِ اسلام کے لئے، نہ کہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:

قد کان رسول الله ﷺ بعث فیما حول مکة السرایا تدعوا الی الله عزو جل ولم یامرهم بقتال (۲)

آنحضرت ﷺ نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے، دعوتِ اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت ﷺ نے سنا تو آپؐ کھڑے ہوگئے اور قبلہ رو ہو کر کہا ''اے خدا خالدؓ نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں''، تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، جنہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا خوں بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی (۳)، یہ واقعہ باختلافِ الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

(اسی طرح ۱۰ ھ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپؐ نے فرمایا:

فاذا نزلت بساحتهم فلا تقاتلهم حتی یقاتلوک (۴)

جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے، تم نہ لڑنا۔

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتحِ مکہ کے بعد بت شکنی کے لئے اطرافِ ملک میں روانہ کئے گئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے، فتحِ مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعتاً نہ مٹ سکا، اب گو وہ ان کو لایقِ پرستش نہیں سمجھتے تھے، تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی وراثتاً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں، جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

اہلِ طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بت خانہ ایک سال تک

(۱) (طبقات ابن سعد جلد مغازی ص ۱۰۶) ''ض'' (۲) تاریخ طبری (جلد ۳) ص ۱۶۴۹ (۳) تاریخ طبری (جلد ۳) ص ۱۶۵۱۔ (۴) ابن سعد مغازی ص ۱۲۲)

ڈھایا نہ جائے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط یہ پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے، بعض اور نو مسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں، چنانچہ سریۂ خالدؓ بن ولید بت خانہ عزیٰ، سریۂ عمروؓ بن العاص بت خانہ سواع، سریۂ سعدؓ بن زید اشہلی بت خانہ مناۃ، سریۂ ابوسفیانؓ ومغیرہؓ بن شیبہ بت خانہ لات، سریۂ جریرؓ بت خانہ ذی الخلصہ (۱)، سریۂ طفیلؓ بن عمرو دوسی بت خانۂ ذی الکفین اور سریۂ علیؓ بن ابی طالب بت خانۂ فلس کے توڑنے (۲) کو روانہ کئے گئے)۔

جنگی اصلاحات: جنگ افعالِ انسانی کا بدترین منظر ہے، عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی، لیکن اعجازِ نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔

کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرز عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے، جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہتے ہیں، آغازِ اسلام میں حملہ اور جنگ کے متعلق بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے، مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے، اور قتل و قید کرتے تھے، اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا، لیکن ابتداء ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعتاً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے، جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی، اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے، ان کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو،

---

(۱) (صحیح بخاری (کتاب المغازی باب غزوۂ ذی الخلصہ ج ۲ ص ۶۲۴) ''ض'' ۔ (۲) اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں) (زرقانی ج ۲ کے آخر ۴۰۰ تا ۴۰۲ پر بھی بعض سرایا اور بت خانوں کا ذکر ہے) ''ض''

اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں۔

اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کیے جائیں۔

آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردارِ فوج کو جو احکام دیئے جاتے، ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا (۱) ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے:

لا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا ولا صغيرا ولا امرأة (۲) — کسی کہن سال کو، بچہ کو، کم سن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔

غزوات میں کبھی کسی عورت کی لاش آپ کی نظر سے گذرتی تو آپ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں (۳)۔

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے، یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو صبر کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔ (۴)

ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحب زادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا، حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سنا تو کہا "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے، خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا"۔ عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے (۵)۔

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی، جنگ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا، یعنی قول وقسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لوا گئے اور گھر لے جا کر قتل کر ڈالا، قرآن مجید میں ان ہی واقعات کی طرف اشارہ ہے:

---

(۱) (صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث و وصیته ایاهم بآداب الغزو وغیرها ج۲ص ۶۲) "ض" (۲) (کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر (۳۵۱ اور ۳۵۴ پر "ض" ہے، یہاں پہلا باب مراد ہے) "س" ج ۱ص ۳۵۲ (۳) کتاب الجہاد (باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب ج ۲ص ۶۵، ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی قتل النساء ج ۲ص ۳۶۲ میں بھی اس مفہوم کی کئی روایتیں ہیں۔ "ض" (۴) ابوداؤد کتاب الجہاد (باب فی قتل الاسیر صبرا ج ۲ص ۳۶۵ و ۳۶۶ کلکتہ اڈیشن) "ض" (۵) ابوداؤد جلد ۲ص ۱۰ (باب قتل الاسیر بالنبل) "س" (ص ۳۶۶ کلکتہ اڈیشن) "ض"۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِىْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً .... کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ قسم کا لحاظ رکھتے ہیں، نہ ذمہ داری

اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ (توبہ۔ ۹ : ۱۰ تا ۱۲) کا........ ان کی قسم قسم نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے، ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے، قرآن مجید میں اس کے متعلق جابجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں، عہد نبوت اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں پابندیِ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے، تو بہت سے صحابہؓ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد بھی تھے، جنگِ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انہوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا، یہ لوگ مقامِ بدر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے مصروفِ جنگ ہیں خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔ (۱)

ابو رافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا، بارگاہ نبوت میں آ کر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے، اس وقت واپس جاؤ، پھر آ جانا (۲)۔

صلحِ حدیبیہ میں جب حضرت ابو جندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں، لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے، اس پر حضرت ابو جندلؓ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوشِ رقت سے بے قرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں، حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے، حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندیِ عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابو جندلؓ کو

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب الوفاء بالعہد ج ۲ ص ۸۹ و اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۹۱۔ (۲) ابو داؤد جلد ۱ ص ۲۷۲ کتاب الجہاد باب فی الامام یستجن بہ فی العہود۔ ''س'' (ج ۳ ص ۳۷۹ کلکتہ اڈیشن) ''ض''

پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔(۱)

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت ﷺ نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا، لیکن باہر والوں نے بچالیا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ نے فرمایا کہ ''قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا''۔ مورخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کیے جاتے تھے(۲)

اسیرانِ جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا، جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

علامہ ابن جبیر حروبِ صلیبیہ کے زمانہ میں سسلی میں گذرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

ومن الفجائع التی یعاینها من حل بلادهم اسری المسلمین یرسفون فی القیود ویصرفون فی الخدمة الشاقة والاسیرات المسلمات کذلک فی اسواقهن خلاخیل الحدید فتنفطر لهم الافئدة (۳)

اور منجملہ ان درد انگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں، اسیرانِ اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت محنتِ شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیرانِ بدر کو جب آپ نے صحابہؓ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہؓ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے (۴)

---

(۱) (ابوجندل کے واقعہ کا ذکر اجمالاً صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیہ ج۲ صفحات ۶۰۱ و ۶۰۲ پر ہے اور اجمالاً ہی صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ ج۲ ص ۸۸ پر بھی ہے لیکن تفصیل اسد الغابہ ج۵ ص ۱۶۱ اور اصابہ ج۷ ص ۳۳ پر ملاحظہ ہو) ''ض''۔ (۲) ابوداؤد (کتاب الجہاد باب فی الرسل ج۲ ص ۳۸۰ کلکتہ اڈیشن) ''ض''۔ (۳) رحلة ابن جبیر مطبوعة لیڈن ۱۹۰۷ء ص ۳۰۷۔ (۴) ابن ہشام ج۱ ص ۳۹۴۔

غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیئے گئے اور آپؐ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے (۱)، چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپؐ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوادیا (۲)

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگانِ خاص کے اوصاف بتائے ہیں، وہاں فرمایا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (دہر ـ ۷۶ : ۸)	اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تھا تو اہلِ فوج چاروں طرف دور دور پھیل جاتے، جس سے راستے بند ہو جاتے، گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا، راہ گیروں کا مال و متاع لٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں، آپؐ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انسؓ) سے روایت ہے:

غزوت مع نبی اللہ ﷺ غزوۃ کذا و کذا فضیق الناس المنازل وقطعوا الطریق فبعث النبی ﷺ منادیا ینادی فی الناس ان من ضیق منزلا وقطع طریقا فلا جہاد لہ (۳)	میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپؐ نے ایک شخص کو بھیجا، جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے، اس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر ادھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے (۴)

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو

---

(۱) طبقات ابن سعد فی ذکر مغازی قسم اول جزء ثانی ص ۱۱۰ تا ۱۱۲۔ (۲) (تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۰۸) ''ض''
(۳) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۴ (باب مایومر من انضمام العسکر) ''س'' (ص ۳۵۳ کلکتہ اڈیشن) ''ض'' (۴) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۴ (باب مایومر من انضمام العسکر) ''س'' (ج ا ص ۳۵۳ کلکتہ اڈیشن) ''ض''

غنیمت محبوب ترین چیز تھی، تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا :

رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا اجر له فاعظم ذلک الناس وقالوا للرجل عد لرسول الله ﷺ فلعلک لم تفهمه [ابوداؤد جلد ا ص ۳۴۲ (باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)] ’’س‘‘(۳۴۱ کلکتہ اڈیشن)’’ض‘‘	ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے، لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے، آپ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھو، غالباً تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ لا اجر لہ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہؓ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے، لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے، اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا، ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے :

فلامنی اصحابی وقالوا احرمتنا الغنیمة (۱)	مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آکر ان کی شکایت کی تو آپؐ نے ان کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا(۲)۔

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت ’’متاع دنیوی‘‘ کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی، جنگِ احد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:

---

(۱) (ابوداؤد باب ما یقول اذا اصبح کتاب الادب)(ج۲ص ۶۹۳)’’ض‘‘۔(۲)(ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقول اذا اصبح جلد۲ص ۶۹۳)’’ض‘‘

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (آل عمران ـ ۳ : ۱۵۲) — تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے، اور کچھ آخرت کے۔

جنگِ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کردی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری:

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (انفال ـ ۸ : ۶۷) — تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور خدا آخرت چاہتا ہے۔

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ھ ہجری میں واقع ہوا تھا، اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہوگئے، صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:

فاقبل المسلمون علی الغنائم واستقبلنا بالسھام ۔(۱) — تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت ﷺ اس مسئلہ کو زیادہ تر تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا (۲) — جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

بالآخر آپؐ نے یہ فرمادیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے، لیکن اگر مجاہد مالِ غنیمت قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہوجاتا ہے، پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے، صحیح مسلم میں آنحضرت ﷺ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

مامن غازیۃ تغزو فی سبیل اللہ فیصیبون الغنیمۃ الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الاٰخرۃ — جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے اور مالِ غنیمت لیتا ہے وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت

---

(۱) (بخاری نے حضرت براءؓ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام، کتاب المغازی باب قول اللہ تعالی یوم حنین جلد۲ ص۶۱۷) ''ض''۔(۲) (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا (ج۱ ص۳۹۴) ''ض''، صحیح مسلم کتاب الامارۃ (باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ تعالی الخ ج۲ ص۱۳۸) ''ض''۔

ویبقی لھم الثلث وان لم یصیبوا غنیمۃ ثم لھم اجرھم . (۱)

میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے، البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعہ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہؓ بن الاسقع ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ ''کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، اس میں وہ برابر کا شریک ہوگا'' ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے حضرت واثلہؓ واپس آکر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے اور کہا ''یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے''۔ انہوں نے کہا ''ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا'' (یعنی اونٹ میں نہیں بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی) (۲)۔

دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور جائداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا، خصوصاً جب کہ رسد ٹھہر جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا، تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے، اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی، آپؐ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا، اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپؐ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپؐ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا ''لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے'' (۳)

لڑائی عبادت بن گئی: اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے، اس قدر پاک اور

(۱) صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب بیان قدر ثواب من غزا فغنم الخ ج ۲ ص ۱۴۰ وابوداؤد باب فی السریہ تخفق (ج ۱ ص ۳۳۸ کلکتہ اڈیشن) ''ض'' ''س'' (۲) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی (باب الرجل یکری دابۃ علی النصف او السھم ''س''۔ (ص ۳۶۳ کلکتہ اڈیشن) ''ض''۔ (۳) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی (باب فی النھی عن النھبی اذا کان فی الطعام قلۃ) ''س'' (ص ۳۶۹ کلکتہ اڈیشن) ''ض''۔

منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دستِ ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ . اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ . (حج۔۲۲: ۳۹ و ۴۰)	جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں، ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے۔

ملک میں ہمیشہ جو فتنہ وفساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن وامان سے بسر نہیں کر سکتے تھے، جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال۔۸: ۳۹)	اور ان سے لڑو تا کہ فتنہ نہ رہے۔

جو لوگ خدا پر اور جزاء وسزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم وستم جائز تھے اور ان کو جائز ونا جائز کی کچھ تمیز نہ تھی، جہاد سے ان کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ۔۹: ۲۹)	ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن کاموں کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے، اس کو حرام نہیں سمجھتے۔

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح دولت ومال اور حکومت کا لطف اٹھائیں، بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت وریاضت اور فقراء کی دست گیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (حج۔۲۲: ۴۱)	وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوۃ ادا کریں گے اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

کسی ملک کی فتح سے جو دولت ومال ہاتھ آتا تھا، وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا جس کو وہ اپنے مصارفِ عیش میں استعمال کرتا تھا اور دربار کے امراء درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے، لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال۔۸: ۴۱)

اور جان لو کہ تم کو جو کچھ غنیمت ملے تو اس کا پانچواں (۱) حصہ خدا کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورتاً بھی عبادت بنا دیا گیا، مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

(انفال۔۸: ۴۵)

مسلمانو! جب کسی گروہ سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللّٰہ اکبر اور سبحان ربی الاعلی کہتے ہیں، جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللّٰہ اکبر کہتے تھے، اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللّٰہ کہتے تھے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ جہاد پر جارہے تھے، صحابہؓ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہئے، کیوں کہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں ہے" (۲) بعینہٖ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا (۳)۔

نکتہ: ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جہاد (۴) میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تھا تو تسبیح پڑھتے تھے، نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی، یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے تو سبحان اللہ کہتے ہیں، اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آگیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی، بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت

(۱) اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب التکبیر عندالحرب (وباب ما یکرہ من رفع الصوت فی التکبیر وباب التسبیح اذا ھبط وادیا ج ۱ ص ۴۲۰)
(۳) مسند احمد ج اول ص ۹۷ پر حضرت علیؓ سے اور جلد دوم میں کئی جگہ حضرت ابن عمر سے بھی اس مفہوم کی روایتیں ہیں۔
"ض" (۴) ابوداؤد کتاب الجہاد (باب ما یقول اذا سافر) جلد ۱ ص ۳۵۷ مطبوعہ مجتبائی، اصل عبارت یہ ہے (وکان النبی ﷺ وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوۃ علی ذلک (ص ۳۵۰ کلکتہ اڈیشن) "ض"

کے بعد سے شروع ہوتی ہے، بہرحال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔

غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم وستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی، اسلام کی تعلیمِ ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیامِ امن، رفعِ مفاسد، نصرتِ مظلوم اور تسبیح وتہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز: جہاد کے معرکوں میں آپؐ کے ہاتھ میں گو تیغ وسپر اور جسمِ مبارک پر خود ومغفر ہوتا تھا، لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔

عین اس وقت جب معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینھ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسمِ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں، عین اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے(۱) فوجیں تیروں کا مینھ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھالیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعتاً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے(۲)

حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، بارہ ہزار آدمیوں میں سے ایک (۳) بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے رہے ہیں، لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پر جلال آواز آ رہی ہے۔

انا النبی لا کذب (۴) میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ

---

(۱) طبقات ابن سعد ذکر مغازی ص ۱۷۔ (۲) طبقات ابن سعد جلد غزوات ص ۱۰۹ و ۱۱۳) "ض" (۳) (چند خاص رفقا کے سوا) "س" (۴) (صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فی غزوۃ حنین ج ۲ ص ۸۳) وصحیح بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ و یوم حنین الخ ج ۲ ص ۶۱۷۔

پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آ جاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز ہیں، رجز کے بجائے اللّٰہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش وخروش، تہور وجاں بازی، غیظ وغضب، اب عجز ونیاز، تضرع وزاری اور خضوع وخشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولینِ جنگ آ کر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسولؐ) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔

تعلیم وارشاد، ہدایت وتلقین، تہذیب وتزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں ''یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے''۔ (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپؐ فرماتے ہیں کہ ''میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں''؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں، کیا؟ ارشاد ہوتا ہے'' نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں''۔(۱)

تم المجلد الاول من السیرة النبویة علی صاحبها الصلوة والتحیة

☆

(۱) ابوداؤد باب التجارۃ فی الغزو (ج۲ ص۳۸۵ کتاب الجہاد کلکتہ اڈیشن) ''ض''

اشاریہ و کتابیات

سیرۃ النبی ﷺ

(حصہ اول)

مرتبہ

روحی طیبی (کراچی)

و

محمد عارف عمری

(رفیق، دارالمصنّفین)

اشخاص

(الف)

(خ)

(غ)

(ف)

(ق)

(ن)

مقامات

☆☆☆☆☆

کتب

☆☆☆

کتابیات

(۱)القرآن الکریم

(۲)احکام القرآن : قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء مطبوعہ مطبعہ السعادہ، مصر ۔۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء

(۳) البحر المحیط :اثیر الدین محمد بن یوسف الشہیر بابی حیان المتوفی ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء۔ مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء

(۴)اخبار مکہ: ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی ۔مطبعہ ماجدیہ، مکہ مکرمہ ۔۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء۔ اس کتاب کا حوالہ جامع سیرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حواشی میں ہے۔

(۵)ارشاد الساری شرح صحیح البخاری: احمد بن محمد بن ابی بکر القسطلانی الشافعی۔ مطبعہ بولاق، مصر۔۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء

(۶) اسباب النزول : علی بن احمد بن محمد الواحدی ۔ قاہرہ، مصر۔ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء

(۷)الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب : ابوعمر یوسف بن عبداللہ النمری القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ/ ۱۰۷۰ء دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء

(۸) اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ : ابوالحسن علی بن عبدالکریم الجزری المعروف بہ ابن الاثیر المتوفی ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء۔ مطبعہ وہبیہ۔ مصر۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء

(۹)الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ : حافظ ابن حجر عسقلانی۔ بشپ کالج پریس، کلکتہ۔ ۱۸۵۶ء۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا دوسرا نسخہ مطبوعہ مطبعۃ السعادہ، مصر۔۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء بھی مصنفؒ کے پیش نظر تھا۔

(۱۰) الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام : مطبعہ خیریہ، مصر۔۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء برحاشیہ خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام از سید زینی دحلان ۔

(۱۱)الانساب : ابوسعد عبدالکریم، النعمانی، المتوفی ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء۔ عکسی مخطوطہ ۱۹۱۶ء

(۱۲)انساب الاشراف :احمد بن یحیی بن جابر بلاذری۔ مطبع وسن اشاعت نامعلوم۔

(۱۳)انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ: علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی مطبعہ ازہریہ، مصر۔۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء

(۱۴)البدایۃ والنہایۃ (تاریخ ابن کثیر) :ابوالفداء اسمٰعیل بن عمر القرشی المعروف بہ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء مطبعہ علمیہ، مصر۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء سیرۃ النبی کی تالیف کے وقت تک یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مصنفؒ کو اس کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب تھا، بعد میں جامع سیرت نے اس سے حوالے دیے ہیں۔

(۱۵) تاریخ الخمیس فی انفس نفیس: حسین بن محمد الدیار بکری۔ مطبعہ وہبیہ، مصر، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء

(۱۶) تاریخ الرسل و الملوک (تاریخ طبری): ابو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ/۹۲۲ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن۔ ۱۸۷۹ء۔

(۱۷) تاریخ یعقوبی: احمد بن ابی یعقوب بن جعفر المعروف بالیعقوبی۔ مطبعہ بریل لائیڈن ۱۸۸۳ء۔

(۱۸) التاریخ الکبیر (تاریخ ابن عساکر): ابو القاسم علی بن الحسن بن العساکر المتوفی ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء مطبعہ روضۃ الشام۔ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء

(۱۹) التاریخ الصغیر: محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ۔ مطبعہ انوار احمدی، الہ آباد۔ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء

(۲۰) التاریخ الکبیر: محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ۔ یہ کتاب مصنفؒ کی نظر سے جامع ایاصوفیہ میں گذری تھی۔ ۱۳۶۰ھ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے طبع ہوئی ہے۔

(۲۱) تاریخی جغرافیہ عرب: ریونڈ فارسٹر۔

(۲۲) تذکرۃ الحفاظ: شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۶ھ/۱۳۴۵ء۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد۔

(۲۳) ترجمہ کتاب ھنری دی کاستری: (عربی ترجمہ) مطبوعہ مصر۔

(۲۴) ترجمہ سیرت ابن اسحاق: محمد بن اسحاق واقدی قلمی، محفوظ کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

(۲۵) تفسیر ابن جریر الطبری: ابو جعفر محمد بن جریر الطبری۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء

(۲۶) تفسیر ابن کثیر: حافظ اسمٰعیل قرشی۔ مطبعہ عامرہ، قاہرہ، ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء برحاشیہ فتح البیان۔

(۲۷) تفسیر جلالین: امام محلی و امام سیوطی۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء

(۲۸) تقریب التہذیب: حافظ ابن حجرؒ۔ مطبعہ احمدی۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء

(۲۹) تمدن عرب: ڈاکٹر گستاؤلی بان، مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی۔ مفید عام پریس، آگرہ، ۱۸۹۸ء

(۳۰) التوسل و الوسیلۃ: علامہ ابن تیمیہ۔ مطبعہ المنار۔ مصر۔ ۱۳۲۷ھ

(۳۱) تہذیب التہذیب: ابن حجر عسقلانیؒ۔ دائرۃ المعارف۔ حیدر آباد ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۹ء

(۳۲) تہذیب الاسماء و اللغات: ابوزکریا محی الدین بن شرف النووی المتوفی ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء ادارۃ الطباعۃ المنیریہ۔ مصر۔

(۳۳) جزء القرأۃ: امام بخاری۔

(۳۴) الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح: شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ مطبعۃ النیل، مصر ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء

(۳۵) الخصائص الکبری: امام جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء دائرۃ المعارف، حیدر آباد ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء۔

(۳۶) خلاصۃ تہذیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال: صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی

مطبعہ کبریٰ میریہ۔ مصر۔۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء۔
(۳۷) رحلة ابن جبیر : محمد بن احمد بن جبیر کنانی متوفی ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء۔ مطبعہ بریل لائیڈن ۱۹۰۷ء
(۳۸) روح المعانی : علامہ شہاب الدین سید محمد آلوسی۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء
(۳۹) الروض الانف : ابوالقاسم عبدالرحمٰن احمد السہیلی متوفی ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء قلمی۔
(۴۰) الریاض النضرة فی مناقب العشرة : ابوجعفر احمد الشہیر بالمحب الطبری۔ مطبعہ حسینیہ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء
(۴۱) زادالمعاد فی هدی خیر العباد: حافظ شمس الدین المعروف بہ ابن القیم۔ المتوفی ۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء مطبعہ نظامی کانپور۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء
(۴۲) سنن ابو داؤد : امام ابوداؤد السجستانی۔ مطبعہ محمدی، دہلی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء و مطبوعہ دیوبند۔
(۴۳) سنن ابن ماجه : ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی المتوفی ۲۷۵ھ/۱۸۸۸ء اصح المطابع لکھنؤ و مطبوعہ دیوبند۔
(۴۴) سنن نسائی: امام نسائی۔ مطبعہ ناصری، دہلی، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء نظامی پریس سے مطبوعہ نسخہ و مطبوعہ دیوبند کا بھی حوالہ ہے۔
(۴۵) سیرة النبی علیه الصلوٰة والسلام: ابومحمد عبدالملک بن ہشام۔ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء برحاشیہ زادالمعاد اس کے علاوہ مصر کے کئی اور نسخے مطبوعہ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء و ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء و مطبوعہ محمد علی صبیح کے بھی حوالے کتاب میں ہیں۔
(۴۶) سیرت گازرونی : شیخ ظہیرالدین گازرونی متوفی ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء قلمی ۔
(۴۷) سیرت منظوم : حافظ زین الدین عراقی
(۴۸) شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیه: محمد بن عبدالباقی زرقانی مکتبہ میسیریہ، مصر ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء
(۴۹) شرح سیر کبیر : محمد بن احمد سرخسی المتوفی ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء دائرۃ المعارف حیدرآباد۔ ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء
(۵۰) شرح معانی الآثار : ابوجعفر طحاوی۔ مطبع مصطفائی۔ لکھنؤ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء
(۵۱) شمائل ترمذی : محمد بن عیسیٰ ترمذی۔ مطبع بولاق، مصر ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء
(۵۲) صحیح بخاری : محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ۔ مطبعہ کرزن گزٹ۔ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء مطبع نظامی کان پور اور دیوبند سے چھپے ہوئے نسخوں کا بھی حوالہ کتاب میں درج ہے۔
(۵۳) الجامع الصحیح: (ترمذی) محمد بن عیسیٰ الترمذی فخر المطابع دہلی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء و مطبوعہ دیوبند
(۵۴) صحیح مسلم : امام مسلم بن حجاج نیشاپوری۔ مطبع نولکشور۔ لکھنؤ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء و مطبوعہ میمنیہ مصر۔

(۵۵) صفة جزيرة العرب : ابو محمد الحسن بن محمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ/۹۴۵ء مطبع بریل لائیڈن۔ ۱۸۸۴ء

(۵۶) طبقات الامم : قاضی صاعد بن احمد اندلسی متوفی ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء مطبعہ کیتھولک، بیروت ۱۹۱۲ء

(۵۷) العقد الفريد : شہاب الدین احمد المعروف بہ ابن عبدربہ۔ مطبعہ عامرہ شرفیہ، مصر ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء

(۵۸) عمدة القاری شرح صحيح بخاری : بدرالدین محمد بن احمد العینی۔ مطبعہ عامرہ مصر ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء

(۵۹) عيون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسير : ابوالفتح محمد بن محمد المعروف بہ ابن سید الناس اندلسی متوفی ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء قلمی۔ مصنف کے پیش نظر اس کتاب کے قلمی نسخہ کی دوسری جلد تھی جو کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں بھی ہے اور یہ کتاب ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء میں مکتبہ قدسی، قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶۰) العهد الجديد (آسمانی کتاب) : مطبعہ ادبیہ، بیروت ۱۸۸۶ء۔

(۶۱) فتح الباری شرح صحيح بخاری : ابوالفضل احمد بن حجر عسقلانی۔ مطبعہ الکبریٰ المیریہ، مصر ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء۔

(۶۲) فتح المغيث شرح الفية الحديث : شمس الدین السخاوی متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء۔ مطبعہ انوار احمدی، لکھنؤ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء

(۶۳) فتوح البلدان : ابوالعباس احمد بن یحییٰ بلاذری متوفی ۲۷۹ھ/۸۹۲ء مطبعہ بریل لائیڈن ۱۸۶۶ء

(۶۴) الكامل فی التاريخ : عزالدین محمد المعروف بہ ابن الاثیر متوفی ۶۳۸ھ/۱۲۳۷ء مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۸۶۶ء

(۶۵) كتاب الامالی : ابوعلی اسمعیل القالی المتوفی ۳۵۶ھ/۹۶۶ء مطبعۃ الامیریہ، مصر ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

(۶۶) کتاب الاموال : ابوعبید القاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ/۸۳۸ء مصر۔

(۶۷) کتاب التنبیہ والاشراف : علامہ مسعودی۔ مطبع بریل لائیڈن ۱۸۹۴ء

(۶۸) کتاب الثقات : حافظ محمد تمیمی بستی متوفی ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء۔ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے غالباً مصنفؒ کے پیش نظر اس کا کوئی قلمی نسخہ تھا۔

(۶۹) كتاب الطبقات الكبيرات : محمد بن سعد کاتب واقدی۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء

(۷۰) كتاب العبر و ديوان المبتدا والخبر فی ايام العرب والعجم والبربر (تاریخ ابن خلدون) : عبدالرحمٰن بن محمد خلدون : دارالطباعہ عامرہ۔ مصر ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء

(۷۱) کتاب الفهرست : ابن ندیم۔ مطبعہ رحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء
(۷۲) الکتاب المقدس: (توراۃ) مطبع مدرسہ آکسفورڈ، لندن۔ ۱۸۹۰ء
(۷۳) الکتاب المغازی من کتب المصنف : ابن ابی شیبہ قلمی۔
(۷۴) کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون : ملا کاتب چلپی مشہور حاجی خلیفہ مطبعۃ العالم ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء
(۷۵) اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ : امام سیوطی۔ مطبعہ ادبیہ، مصر ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء
(۷۶) لباب النقول فی اسباب النزول: امام سیوطی۔ مطبعہ میمنیہ، مصر ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء برحاشیہ تفسیر جلالین ۔
(۷۷) لسان المیزان : حافظ ابن حجرؒ۔ دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء
(۷۸) مجمع الامثال : کرمانی۔ ایران۔
(۷۹) مختصر جامع بیان العلم و فضلہ : ابو عمر بن عبدالبر النمری۔ مطبعہ الموسوعات، مصر ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء
(۸۰) المختصر فی سیرۃ سید البشر: (سیرت دمیاطی) حافظ عبدالمؤمن دمیاطی متوفی ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۵ء قلمی۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مصنفؒ کی نظر سے پٹنہ کے کتب خانہ میں گذرا تھا۔
(۸۱) مستدرک حاکم. محمد بن عبداللہ المعروف بالحاکم النیشاپوری: مطبعۃ العلوم (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء) مطبع مجتبائی (۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء) دائرۃ المعارف حیدرآباد (۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء)
(۸۲) مسند ابی داؤد الطیالسی : حافظ سلیمان بن داؤد بن الجارود۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء
(۸۳) مسند امام احمد بن حنبل : امام احمدؒ۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء
(۸۴) مشتبہ النسبۃ : ابو محمد عبدالغنی الازدی متوفی ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء مطبعہ انوار احمدی الہ آباد ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء
(۸۵) المشتبہ فی اسماء الرجال : امام ذہبی۔ مطبعہ بریل، لائیڈن۔ ۱۸۶۳ء
(۸۶) المعارف : ابن قتیبہ دینوری۔ مطبعہ اسلامیہ، مصر ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء
(۸۷) المعجم ا لصغیر : ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی۔ مطبعہ انصاری، دہلی۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء
(۸۸) معجم البلدان : شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الحموی۔ مطبعہ السعادۃ، مصر ۱۳۲۳ھ/۱۸۸۳ء
(۸۹) المغازی : ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی۔ بشپ مشن پریس، کلکتہ ۱۸۸۵ء
(۹۰) الملل والنحل: ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی المتوفی ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء مطبعہ ادبیہ مصر ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء برحاشیہ الفصل فی الملل والاہواء والنحل: ابن حزم
(۹۱) المنار فی الاصول : عبداللہ بن احمد ابوالبرکات النسفی۔ قلمی

(۹۲) المواهب اللدنيه : احمد بن محمد القسطلانی۔ مکتبہ میسیریہ، مصر ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء

(۹۳) المؤتلف و المختلف فی اسماء نقلة الحدیث : ابو محمد عبدالمغنی بن سعید الازدی۔ مطبعہ انوار احمدی، الہ آباد۔ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء

(۹۴) الموضوعات الکبیر : ملا علی قاری ہروی۔ مطبعہ مجتبائی، دہلی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء

(۹۵) المؤطا : امام مالکؒ بن انس۔ مطبعہ السعادہ، مصر ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء برحاشیہ المنتقی شرح مؤطا۔ و مؤطا احمدی، دہلی۔

(۹۶) معرکہ مذہب و سائنس : ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر، مترجمہ مولانا ظفر علی خاں۔ رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور۔ ۱۹۱۰ء۔

(۹۷) میزان الاعتدال فی نقد الرجال : حافظ شمس الدین ذہبی۔ مطبعہ السعادہ، مصر ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء

(۹۸) نصب الرایة لاحادیث الهدایة : جمال الدین عبداللہ زیلعی۔ مطبعہ علوی۔ لکھنؤ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء

(۹۹) نور الانوار شرح منار : ملا جیون امیٹھوی۔ مطبعہ علی بخش۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء

(۱۰۰) نور العین فی تلخیص سیر الامین المامون : (ترجمہ فارسی کتاب سیرت حلبیہ) مطبعہ محمدی۔

(۱۰۱) نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس : ابراہیم بن محمد، مصنفؒ کے عہد میں اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں تھا۔

(۱۰۲) وفاء الوفا باخبار دار المصطفی ﷺ : نور الدین علی بن سید السمہودی المتوفی ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء مطبعۃ الآداب۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء۔

☆☆☆☆☆

REFERENCES OF ENGLISH BOOKS

1- Encyclopaedia Britanica Article " Arab" By. G.W.Theacher 11th Edition 1910 - 11

2- Do, Article " Islam" By. Wilhousen.

3- Encyclopaedia of Ethics.

4- Dictionary of the Bible, By. Dr. Histenges.

5- Life of Mohammed. By. Margoleos , 1905

6- Life of Mohammed. By. W. Muir. 1912.

7- Gold Mines of Median, By. Berten.

8- A Literary History of Arabs. By. R.A. Nicholson, London, 1907.

9- Historian's History of the World. By. Prof. Nowldeke. 1908.

10- Mohammed & Mohammedanism. By. Bosworth Smith.

11-A Literary History of Persia . E.G. Brown 1909.

12- Heroes and Hero worship. By. Carlyle. 1846.